جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
مارچ ۲۰۱۳ء

ماہنامہ
میثاق (لاہور)

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اکلِ حلال کی اہمیت

”اربعینِ نوویؒ“ کی ایک حدیث کی تفہیم

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

دینی و عصری علوم کی منفرد دانش گاہ

کُلّیۃ القُرآن (قرآن کالج)

(وفاق المدارس سے الحاق شدہ)

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

علمِ دین اور فکرِ حاضر کے حسین امتزاج کی ایک منفرد کوشش

بورڈ/یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ درسِ نظامی کا مکمل نصاب

قیام و طعام کی سہولت موجود ہے

خصوصیات

☆ تجربہ کار، اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرسین
☆ قرآنی موضوعات پر خصوصی فکری و عملی رہنمائی
☆ تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام
☆ طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے بہترین مواقع
☆ علوم اسلامیہ کے ساتھ جدید علوم یعنی درس نظامی مع میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے
☆ اسباق وفاق المدارس العربیہ اور لاہور بورڈ کے نصاب کے مطابق
☆ خوبصورت عمارت اور کلاس رومز
☆ کمپیوٹر لیب ☆ بہترین اور مکمل لائبریری
☆ کانفرنس اور مذاکرہ ہال
☆ اسلامی اخلاقیات کی مکمل پابندی
☆ رہائش کے لیے بہترین ہوادار اور روشن کمرے
☆ خوراک حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق
☆ طلبہ کی تدریسی ضروریات پوری کرنے میں معاونت
☆ وقت کا مؤثر استعمال
☆ مواقع تفریح کی فراہمی

نشستیں محدود ہیں!

مڈل کے امتحان کے نتائج کے منتظر طلبہ بھی درخواست جمع کرا سکتے ہیں

مقامی و دیگر شہروں کے طلبہ کے لیے درجہ اولیٰ و ثانیہ (میٹرک) اور ثالثہ میں نئے تعلیمی سال کے داخلے جاری ہیں

آغازِ داخلہ: 15 مارچ
انٹرویو: 26 مارچ

معلومات داخلہ

☆ نئے سال کے لیے خواہش مند طلبہ کلیۃ القرآن آفس سے داخلہ فارم اور انٹری ٹیسٹ کے لیے سلیبس وصول کر سکتے ہیں۔
☆ داخلہ فارم کے لیے انٹری ٹیسٹ اور انٹرویو پاس کرنا لازمی ہے۔
☆ مزید معلومات کے لیے ناظم اعلیٰ کلیۃ القرآن یا نائب ناظم سے رابطہ کریں!
☆ امسال شوال میں داخلے نہیں ہوں گے۔

شرائط داخلہ

☆ درجہ اولیٰ کے لیے متوسطہ یا مڈل پاس، ثانیہ کے لیے نہم اور اولیٰ پاس اور ثالثہ کے لیے وفاق المدارس سے عامۃ اور بورڈ سے میٹرک پاس ہونا لازمی ہے۔
☆ دیگر تعلیمی اداروں سے کم از کم مڈل
☆ اپنے علاقے کے عالم دین سے یا سابقہ مدرسہ سے تصدیق نامہ
☆ سرپرست کی طرف سے ضمانت نامہ
☆ ٹیسٹ اور انٹرویو میں کامیابی

برائے رابطہ

ناظم اعلیٰ کُلّیۃ القرآن (قرآن کالج)
191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون: 35833637-(042)35860024
پرنسپل: طارق مسعود 0321-4506196

ذیلی دفتر: قرآن اکیڈمی
K-36 ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: 3-(042)35869501
فیکس: (042)35834000، ای میل: irts@tanzeem.org

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد m

جلد :	62
شمارہ :	3
جمادی الاولیٰ	1434ھ
مارچ	2013ء
فی شمارہ	-/25

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرونِ ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مجلد جدید پریس (پرائیویٹ) چنگا

مشمولات

عرضِ احوال		3
لیک بعد از خرابیٔ بسیار!	ایوب بیگ مرزا	
بیانُ القرآن		5
سورۂ ھُود (آیات ۶۹ تا ۱۲۳)	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	
مطالعۂ حدیث		33
اکلِ حلال کی اہمیت	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	
تذکّر و تدبّر		51
قرآن میں لفظ ''رجال'' کا مفہوم	حافظ محمد مشتاق ربانی	
السّیاسۃ الشّرعیہ		56
امام وخلافت: چند مباحث	مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ	
دعوت فکر		61
اصطلاح کی بحث: جمہوریت یا نظامِ خلافت؟	محمد احمد بلال	
توضیح و تنقیح		72
اللہ کے لیے لفظ خدا کا استعمال	انجینئر حافظ نوید احمد	
مزاحِ لطیف		77
ظرافت کی حقیقت اور بزرگوں کی خوش طبعی	حافظ گوہر ایوب گوہر	
حقوق و فرائض (۲)		83
والدین کے فرائض' اولاد کے حقوق	بیگم ڈاکٹر عبدالخالق	
تعلیم و تعلّم		91
ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور ''منتخب نصاب''	شمیم انصاری	

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

لیک بعداز خرابیٔ بسیار!

فارسی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے:ے

ہر چہ دانا کند کند ناداں   لیک بعد از خرابیٔ بسیار!

یعنی ''جو کام دانا کرتا ہے وہی کام بالآخر نادان بھی کرتا ہے' لیکن بڑی خرابی کے بعد''۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ نائن الیون کے فوراً بعد ایک شور اٹھا: پکڑلو جانے نہ پائے' کچل دو' نیست و نابود کردو' یہ دہشت گرد ہیں' یہ انسانیت کے دشمن ہیں' یہ جاہل غیر مہذّب لوگ مہذّب سوسائٹی کے دشمن ہیں۔ دنیا کو پُرامن بنانے کے لیے انہیں صفحہ ہستی سے مٹانا ناگزیر ہے۔ صبح کو اخبارات ان سلوگنز سے سیاہ ہوتے تھے اور رات کو ٹاک شوز میں سیکولر عناصر دہائی دے رہے ہوتے تھے اور خوب چیخ وپکار ہو رہی ہوتی تھی ۔ایسے میں دھماکہ سے کوئی شہر لرز اٹھتا تو تہذیب کے ٹھیکیداروں کی طرف سے بیانات جاری ہوتے: یہ دھماکے دہشت گردی کے خلاف ہمارے عزائم کو کمزور نہیں کر سکتے' دہشت گرد ہتھیار پھینک دیں' مذاکرات انسانوں سے ہوتے ہیں' درندوں سے نہیں ہوتے۔ بارہ سال یہ شور مسلسل ہوتا رہا۔ ایسا شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ دینی جماعتوں کی طرف سے یا تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان کی طرف سے اگر یہ بات آتی کہ ہمیں پرائی جنگ سے دُور رہنا چاہیے اور جو ہمارے بھائی ناراض ہیں ان سے مذاکرات کرنا چاہیے تو ان کا تمسخر اڑایا جاتا تھا' انہیں طالبان کا ساتھی کہا جاتا تھا' جیسے ''طالبان'' کوئی طعنہ ہے یا گالی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان کے تعاون سے امریکہ جو ڈرون حملے کر کے انسانی جسموں کے پرخچے اڑاتا تو اس پر احتجاج تو دور کی بات ہے میڈیا سب مرنے والوں کو دہشت قرار دے دیتا' حالانکہ ان قبائلی علاقوں میں میڈیا کو جانے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ کئی دینی مدارس پر حملے کیے گئے جس سے قرآن پاک پڑھتے اور حفظ کرتے سینکڑوں بچے شہید ہو جاتے۔ بہرحال نائن الیون کے واقعہ کے بعد شروع ہونے والا یہ شور وغوغا پچھلے چند ماہ پہلے تک بڑے زور و شور سے جاری تھا۔ پھر تھوک کے چاٹنے کا سلسلہ

شروع ہوا اور وہاں ہی سے شروع ہوا جہاں نائن الیون کا ڈرامہ رچایا گیا تھا۔ اب ہر طرف مذاکرات مذاکرات کی رٹ لگائی جارہی ہے۔ یعنی خود کو مہذب اور تہذیب یافتہ کہنے والے اور طالبان کو درندہ کہنے والے ان ''درندوں'' سے مذاکرات کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ آہ کاش! طالبان کو طعن کرنے والے اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کی اخلاقی جرأت رکھتے۔ خصوصاً پاکستان کی حکومت جس کے سربراہ نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا کہ ''وعدہ کوئی قرآن وحدیث تو نہیں!''

گزشتہ بارہ سالوں میں اگر کسی سمت سے مذاکرات یا امن کی بات آتی تو وہ سیکولر عناصر یہ کہہ کر بات کو ہوا میں اڑا دیتے کہ یہ لوگ قابل اعتماد نہیں' یہ مذاکرات کی بات time buy کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ لوکل سطح پر کچھ معاہدے ہوئے جو امریکہ نے سبوتاژ کر دیے۔ سب سے پہلا معاہدہ نیک محمد کی سربراہی میں تحریک طالبان پاکستان سے ہوا' لیکن اسی رات امریکہ نے ڈرون حملہ سے نیک محمد کو شہید کر دیا۔ جبکہ چند گھنٹے پہلے گورنر پختونخوا نے صلح کی خوشی میں نیک محمد کو ہار پہنائے تھے۔ بہرحال اب مذاکرات مذاکرات کی رٹ لگائی جارہی ہے تو یہ طے کرنا انتہائی مشکل ہے کہ کون کس سے مذاکرات کرے۔ اس لیے کہ مرکز میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ہے' طالبان کسی صورت ان پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ صوبے میں اے این پی کی حکومت ہے' لیکن اس صوبائی حکومت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ عوام کی حمایت سے مکمل طور پر محروم ہو چکی ہے' اور طالبان یہ بھی جانتے ہیں کہ اے این پی امریکہ کے کس قدر قریب ہو چکی ہے اور وہ فوج کو کس طرح قبائلی علاقوں میں آپریشن کے لیے اکساتی رہی ہے' اور یہ بھی کہ وہ پختون ہو کر پختونوں کی نسل کشی کے لیے غیروں سے ہر قسم کا تعاون کر رہی ہے۔ پھر طالبان نے بھی اے این پی کے بہت سے لیڈران کو' جن میں بشیر بلور جیسے سینئر لوگ شامل تھے' قتل کیا ہے۔

ادھر تحریک طالبان پاکستان کا بھی معاملہ ہے کہ ان میں بہت سے دھڑے ہیں۔ ان میں اگرچہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس تصور کے تحت پاکستان کی سیکورٹی ایجنسیوں سے جنگ کر رہے ہیں کہ پاکستانی حکومت مکمل طور پر امریکہ کے تابع ہو چکی ہے اور امریکی احکامات پر بے چون وچرا عمل کرتی ہے' لہٰذا انہیں حق حاصل ہے کہ جو ان پر حملہ کرے وہ اس پر جوابی حملہ کریں۔ کچھ لوگوں کے امریکی ڈرون حملوں سے یا پاکستانی طیاروں سے گھر بار مکمل طور پر تباہ ہو چکے ہیں اور ان کے اہل خانہ کی اکثریت ان حملوں میں جاں بحق ہو گئی ہے۔ ایسی

(باقی صفحہ 95 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃ ھُود

آیات ۶۹ تا ۸۳

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ
جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ
خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٠﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَاۗىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ
فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَاۗءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿٧١﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا
عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ
اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿٧٣﴾ فَلَمَّا
ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَاۗءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ
اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿٧٥﴾ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَاۗءَ اَمْرُ
رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿٧٦﴾ وَلَمَّا جَاۗءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْۗءَ
بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿٧٧﴾ وَجَاۗءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ
اِلَيْهِ ۭ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ هُنَّ
اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۭ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿٧٨﴾
قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿٧٩﴾ قَالَ لَوْ
اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿٨٠﴾ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ
يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا

اِمْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ
الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿٨١﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا
حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ڏ مَّنْضُوْدٍ ﴿٨٢﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ
بِبَعِيْدٍ ﴿٨٣﴾

اب ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آ رہا ہے‘ مگر آپ کا ذکر انباء الرسل کے طور پر نہیں بلکہ بالکل مختلف انداز میں ہے۔ یہاں رسولوں کے ذکر میں ایک خوبصورت تقسیم کو مدنظر رکھیں‘ کہ اس سورت میں پہلے تین رسول جن کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا ہے (حضرت نُوح‘ حضرت ہُود اور حضرت صالح علیہم السلام) ان کا ذکر کرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر مختصراً قصص النبیین کے انداز میں آیا ہے‘ اور آپؑ کے ذکر کے بعد پھر تین رسولوں کا تذکرہ ہے جو آپؑ ہی کی نسل میں سے تھے‘ بلکہ اُن میں سے حضرت لُوط علیہ السلام تو آپؑ کے بھتیجے اور ہم عصر بھی تھے۔ یہاں پر حضرت لُوط علیہ السلام کا ذکر انباء الرسل کے انداز میں آیا ہے اور اسی کے ذیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ جب حضرت لُوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو عذاب کے فرشتے براہِ راست حضرت لُوط علیہ السلام کے پاس جانے کے بجائے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس گئے اور وہاں نہ صرف قومِ لوطؑ پر عذاب کے بارے میں اُن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مکالمہ ہوا بلکہ فرشتوں نے حضرت سارہؑ کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری بھی دی۔

یاد رہے کہ سورۃ الاعراف میں بھی جب ان چھ رسولوں کا تذکرہ انباء الرسل کے انداز میں ہوا تو وہاں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا گیا اور جب سورۃ الانعام (جو سورۃ الاعراف کی جڑواں سورت ہے) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ آیا تو انباء الرسل کے انداز میں نہیں بلکہ قصص النبیین کے انداز میں آیا ہے۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن حکیم میں اس طرح کہیں بھی نہیں آیا کہ آپؑ کو اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا گیا ہو‘ آپؑ نے اپنی قوم کو دعوتِ توحید دی ہو‘ قوم اس دعوت سے منکر ہوئی ہو اور پھر اس پر عذاب بھیج دیا گیا ہو۔

آیت ۶۹ ﴿وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ﴾ ”اور ابراہیمؑ کے پاس ہمارے فرستادے بشارت لے کر آئے۔ انہوں نے کہا: سلام!“

﴿قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾﴾ ”ابراہیمؑ نے بھی (جواب

میں) سلام کہا' پھر کچھ دیر نہ گزری کہ آپؑ لے آئے ایک بچھڑا بھنا ہوا''

مہمانوں کی آمد کے فوراً بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی ضیافت کے لیے ایک بچھڑا ذبح کیا اور اسے بھون کر ان کے سامنے پیش کر دیا۔

آیت ۷۰ ﴿فَلَمَّا رَاٰۤ اَیۡدِیَہُمۡ لَا تَصِلُ اِلَیۡہِ﴾ ''پھر جب آپؑ نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں''

﴿نَکِرَہُمۡ وَ اَوۡجَسَ مِنۡہُمۡ خِیۡفَۃً ؕ﴾ ''تو آپؑ نے ان میں اجنبیت پائی اور ان کی طرف سے ایک خوف محسوس کیا۔''

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محسوس کیا کہ رسمی اصرار کے باوجود بھی مہمان کسی طور کھانے کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہے تو اب آپؑ بجا طور پر کھٹکے کہ یہ پراسرار لوگ کون ہیں اور یہاں کس ارادے سے آئے ہیں؟ اُس زمانے میں یہ رواج بھی تھا کہ اگر کوئی شخص دشمنی کی غرض سے کسی کے پاس جاتا تو اس کے ہاں کا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی طرف سے خدشہ محسوس ہوا۔ جب انہوں نے آپؑ کا یہ خوف محسوس کیا تو:

﴿قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمِ لُوۡطٍ ﴿ؕ۷۰﴾﴾ ''انہوں نے کہا: آپؑ ڈریئے نہیں' اصل میں تو ہم بھیجے گئے ہیں قومِ لوطؑ کی طرف۔''

یعنی ہم فرشتے ہیں اور ہمیں قومِ لوطؑ کی طرف عذاب کی غرض سے بھیجا گیا ہے۔

آیت ۷۱ ﴿وَ امۡرَاَتُہٗ قَآئِمَۃٌ فَضَحِکَتۡ﴾ ''اور آپؑ کی بیوی (کہیں قریب) کھڑی تھی تو وہ ہنس پڑی''

حضرت سارہؑ قریب ہی کہیں پردے کے پیچھے کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھیں تو آپؑ شاید حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حالت پر ہنس پڑیں کہ میرے شوہر فرشتوں سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔

﴿فَبَشَّرۡنٰہَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَ مِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ یَعۡقُوۡبَ ﴿۷۱﴾﴾ ''تو ہم نے اسے بشارت دی اسحاقؑ کی اور اسحاقؑ کے بعد یعقوبؑ کی۔''

یعنی فرشتوں نے حضرت سارہؑ کو حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری دی اور ساتھ ہی حضرت یعقوبؑ یعنی پوتے کی بھی۔ اس وقت حضرت ہاجرہؑ کے ہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہو چکی تھی۔ حضرت سارہؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی تھیں جبکہ حضرت ہاجرہؑ کو

آپؑ کی خدمت میں بادشاہِ مصر نے پیش کیا تھا۔ یہودیوں کے ہاں حضرت ہاجرہؑ کو کنیز سمجھا جاتا ہے' حالانکہ آپؑ مصر کے شاہی خاندان کی خاتون تھیں۔ آپؑ کے ہاں حضرت اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی تو حضرت ابراہیمؑ ان دونوں (ماں اور بیٹے) کو اللہ کے حکم سے حجاز میں اس جگہ چھوڑ آئے جہاں بعد میں بیت اللہ تعمیر ہونا تھا۔ بہرحال حضرت سارہؑ کے ہاں اس وقت تک کوئی اولاد نہیں تھی۔ چنانچہ فرشتوں نے آپؑ کو بیٹے کی اور پھر اس بیٹے کے بیٹے کی ولادت کی بشارت دی۔

آیت ۷۲ ﴿قَالَتۡ یٰوَیۡلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوۡزٌ وَّ ہٰذَا بَعۡلِیۡ شَیۡخًا ؕ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ عَجِیۡبٌ ﴿۷۲﴾﴾ ''اُس نے کہا: ہائے میری شامت! کیا اب میں بچہ جنوں گی جبکہ میں نہایت بوڑھی ہو چکی ہوں اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں! یہ تو بہت عجیب بات ہے۔''

آیت ۷۳ ﴿قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ﴾ ''فرشتوں نے کہا: کیا آپؑ تعجب کرتی ہیں اللہ کے فیصلے پر؟''

یعنی یہ تو اللہ کا فیصلہ ہے اور ہم اللہ کی طرف سے آپؑ کو خوشخبری دے رہے ہیں۔

﴿رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ ؕ﴾ ''اللہ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے نبیؑ کے گھر والو!''

اس آیت میں ''اہل بیت'' کا مفہوم بہت واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ یہاں پر اس کا مصداق حضرت سارہؑ کے علاوہ کوئی اور نہیں' لہٰذا یہاں لازمی طور پر آپؑ ہی اہل بیت ہیں۔ چنانچہ محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں بھی اہلِ بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم' آپؐ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ہی ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان جو حضرت فاطمہ' حضرت علی' حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہے: ((اَللّٰھُمَّ ھٰٓؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ))[۱] تو یہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل بیت کے دائرے کو وسعت دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ بھی میرے اہل بیت میں شامل ہیں۔

﴿اِنَّہٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ ﴿۷۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ لائق حمد اور بزرگی والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے اور وہ بہت عظمتوں والا ہے۔

آیت ۷۴ ﴿فَلَمَّا ذَہَبَ عَنۡ اِبۡرٰہِیۡمَ الرَّوۡعُ وَ جَآءَتۡہُ الۡبُشۡرٰی یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ

(۱) السنن الکبریٰ للبیھقی ۱۵۰/۲۔ عن أم سلمة ھند بنت ابی أمیة۔

لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ ''پھر جب ابراہیمؑ کا خوف جاتا رہا اور یہ بشارت بھی پہنچ گئی' تو آپؑ نے جھگڑنا شروع کر دیا ہم سے قومِ لوطؑ کے بارے میں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ مجادلہ تورات میں بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں سے کہا کہ اگر ان بستیوں میں پچاس آدمی بھی راست باز ہوئے تو کیا پھر بھی ان کو ہلاک کر دیا جائے گا؟ فرشتوں نے جواب دیا کہ نہیں' پھر انہیں ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چالیس آدمیوں کا پوچھا' تو انہوں نے کہا کہ پھر بھی اُن کو تباہ نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ اس طرح بات ہوتے ہوتے پانچ آدمیوں پر آ گئی۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا گیا کہ آپ اس بحث کو چھوڑ دیں۔ اب تو آپؑ کے رب کا فیصلہ آ چکا ہے' کیونکہ ان بستیوں میں خود حضرت لوط علیہ السلام اور اِن کی دو بیٹیوں کے علاوہ کوئی ایک متنفس بھی راست باز نہیں ہے۔

آیت ۷۵ ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾﴾ ''یقیناً ابراہیمؑ بہت ہی بردبار' نرم دل اور اللہ کی جناب میں رجوع کرنے والے تھے۔''

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ تین صفات ایک ساتھ جمع فرما کر آپؑ کی بہت قدر افزائی بھی فرمائی گئی ہے اور آپؑ کے مجادلہ کرنے کی وجہ بھی بیان فرما دی گئی ہے کہ چونکہ آپؑ بہت حلیم الطبع اور دل کے نرم تھے' اسی وجہ سے آپؑ نے آخری حد تک کوشش کی کہ عذاب کے ٹلنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ اسی طرح محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت مبارک میں بھی خصوصی نرمی تھی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی اللہ نے طبیعت کی خاص نرمی عطا کر رکھی تھی۔

آیت ۷۶ ﴿يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ﴾ ''اے ابراہیمؑ چھوڑیے اس معاملے کو' اب تو آپؑ کے رب کا فیصلہ آ چکا ہے۔''

﴿وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾﴾ ''اور ان پر وہ عذاب آ کر ہی رہے گا جسے لوٹایا نہیں جا سکے گا۔''

آیت ۷۷ ﴿وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا﴾ ''اور جب آئے ہمارے فرستادے لوطؑ کے پاس تو آپؑ ان کی وجہ سے بڑے غمگین ہوئے' اور آپؑ کا دل بہت تنگ ہوا''

﴿وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾﴾ ''اور آپؑ کہنے لگے کہ آج تو بہت سختی کا دن ہے۔''

چونکہ ان بستیوں کے لوگوں میں اَمرد پرستی عام تھی' لہٰذا ان کی آخری آزمائش کے لیے فرشتوں کو ان کے پاس نوجوان خوبصورت لڑکوں کے روپ میں بھیجا گیا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام ان خوبصورت مہمان لڑکوں کو دیکھ کر اسی لیے پریشان ہوئے کہ اب وہ اپنے ان مہمانوں کا دفاع کیسے کریں گے۔ اس لیے کہ آپؑ جانتے تھے کہ ان کی قوم کے لوگ کسی اپیل یا دلیل سے باز آنے والے نہیں تھے اور آپؑ اکیلے زبردستی انہیں روک نہیں سکتے تھے۔

آیت ۷۸ ﴿وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۭ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ﴾ ''اور آئے آپؑ کی قوم کے لوگ دیوانہ وار دوڑتے ہوئے آپؑ (کے گھر) کی طرف' اور وہ پہلے سے ہی گندے کاموں میں ملوث تھے۔''

﴿قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ﴾ ''لوطؑ نے فرمایا: اے میری قوم کے لوگو! یہ میری بیٹیاں (موجود) ہیں' وہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں''

مفسرین نے اس کے ایک معنی تو یہ مراد لیے ہیں کہ تمہارے گھروں میں تمہاری بیویاں موجود ہیں جو میری بیٹیوں ہی کی مانند ہیں' کیونکہ نبی اپنی پوری قوم کے لیے باپ کی طرح ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ الاحزاب آیت ۶ میں حضور ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ۭ﴾ کہ آپؐ کی تمام ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن مؤمنین کی مائیں ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں' اُن سے جائز اور پاکیزہ طریقے سے نکاح کر لو' میں اس کے لیے تیار ہوں' لیکن میرے ان مہمانوں کے بارے میں مجھے رسوا نہ کرو۔

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۭ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾﴾ ''تو اللہ کا خوف کرو اور مجھے میرے مہمانوں کے معاملہ میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی ایک آدمی بھی نیک چلن نہیں ہے؟''

کیا تم لوگوں میں کوئی ایک بھی شریف النفس انسان نہیں ہے جو میرا ساتھ دے اور ان سب لوگوں کو بداخلاقی اور بے حیائی سے روکے۔

آیت ۷۹ ﴿قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾﴾

''انہوں نے کہا کہ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ تمہاری ان بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے' اور تم خوب جانتے ہو جو ہم چاہتے ہیں۔''

قوم کے لوگوں نے کہا کہ اب آپؑ اِدھر اُدھر کی باتیں مت کیجیے' آپ خوب سمجھتے ہیں کہ ہمارا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔

آیت ۸۰ ﴿قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾﴾ ''لوطؑ نے کہا: کاش میرے پاس تمہارے مقابلہ کے لیے کوئی طاقت ہوتی یا کوئی مضبوط سہارا ہوتا جس کی میں پناہ لے لیتا۔''

اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((یَرْحَمُ اللّٰہُ لُوْطًا لَقَدْ کَانَ یَاْوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ))(۱) ''اللہ رحم فرمائے لوطؑ پر' وہ ایک مضبوط قلعہ میں ہی تو تھے''۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی پشت پناہی اور حفاظت تو حضرت لوط علیہ السلام کو حاصل تھی۔ لیکن اس وقت جو صورتِ حال بن گئی تھی اس میں بر بنائے طبع بشری پریشانی اور خوف کا طاری ہو جانا نبوت کی عصمت کے منافی نہیں ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی وقتی طور پر جادوگروں کے سانپوں سے ڈر گئے تھے۔

آیت ۸۱ ﴿قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْکَ﴾ ''فرشتوں نے کہا: اے لوطؑ! ہم آپؑ کے رب کے بھیجے ہوئے (فرشتے) ہیں' یہ لوگ آپؑ تک نہیں پہنچ پائیں گے''

فرشتوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے آپؑ کو تسلی دی کہ آپؑ اطمینان رکھیں' یہ لوگ آپؑ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔ پھر فرشتے نے اپنا ہاتھ ہلایا تو وہ سب نابکار اندھے ہو گئے۔

﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِکَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْکُمْ اَحَدٌ﴾ ''پس آپؑ رات کے (اس بقیہ) حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جائیں اور کوئی بھی آپ میں سے پیچھے مڑ کر نہ دیکھے''

یعنی یہاں سے جاتے ہوئے آپ لوگوں کو پیچھے رہ جانے والوں کی طرف کسی قسم کی کوئی توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿اِلَّا امْرَاَتَکَ ۭ اِنَّهٗ مُصِیْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ۭ﴾ ''سوائے آپؑ کی بیوی کے' اس پر

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب قولہ عزوجل ونبئھم عن ضیف ابراھیم۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب زیادۃ طمانینۃ القلب بتظاہر الادلۃ

بھی وہی مصیبت آئے گی جو سب پر آنے والی ہے۔''

یعنی جب آپؑ اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکلیں گے تو اپنی بیوی کو ساتھ لے کر نہیں جائیں گے۔ آپؑ کی اس بیوی کا ذکر سورۃ التحریم میں حضرت نوح علیہ السلام کی مشرک بیوی کے ساتھ اس طرح ہوا ہے: ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَّقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ﴿۱۰﴾﴾ ''اللہ کافروں کے لیے مثال بیان کرتا ہے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی۔ وہ دونوں عورتیں ہمارے دو برگزیدہ بندوں کے تحت تھیں لیکن انہوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی' چنانچہ ان کے شوہر انہیں اللہ کے عذاب سے بچا نہیں سکے۔ اور (ان دونوں عورتوں سے) کہہ دیا گیا کہ تم بھی (جہنم میں) داخل ہونے والوں کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔''

﴿اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ﴿۸۱﴾﴾ ''ان کے وعدے کا وقت صبح کا ہے' کیا صبح قریب نہیں ہے!''

فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا کہ اب آپ لوگوں کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپؑ فوری طور پر اپنی بچیوں کو لے کر یہاں سے نکل جائیں' صبح ہوتے ہی ان بستیوں پر عذاب آ جائے گا۔ اور صبح ہونے میں اب دیر ہی کتنی ہے!

آیت ۸۲ ﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا﴾ ''پھر جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے اس کے اوپر (کے حصے) کو نیچا کر دیا''

یعنی ان بستیوں کو تلپٹ کر دیا گیا۔ جب عمارتیں تباہ ہوتی ہیں تو چھت زمیں بوس ہو جاتی ہے اور دیواریں اس کے اوپر گرتی ہیں' بنیادیں بھی اوپر آ جاتی ہیں۔

﴿وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾﴾ ''اور (مزید) ہم نے ان پر بارش برسائی تہہ بر تہہ کنکریوں کی۔''

سِجّیل اصل میں فارسی لفظ ہے۔ فارسی میں یہ ''سنگِ گِل'' تھا جو عربی میں آ کر سِجّیل کا تلفظ اختیار کر گیا۔ سنگ کے معنی پتھر اور گل کے معنی مٹی کے ہیں۔ یعنی مٹی کے پتھر جو گیلی مٹی کے دھوپ میں گرم ہو کر پختہ ہو جانے کے بعد بنتے ہیں' جیسے اینٹوں کو بھٹے میں پکایا جاتا ہے۔

ان بستیوں پر عذاب دو صورتوں میں آیا' ایک زمین کے اندر کوئی زوردار دھماکہ ہوا' جس کے نتیجے میں زبردست زلزلہ آیا اور یہ بستیاں الٹ پلٹ ہوگئیں۔ پھر اوپر سے کنکریوں کی بارش ہوئی اور اس طرح انہیں ان پتھروں کے اندر دفن کر دیا گیا۔

آیت ۸۳ ﴿مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ﴾ ''وہ نشان زدہ تھے تمہارے رب کی طرف سے۔''

یعنی ہر پتھر ایک آدمی کے لیے نشان زدہ اور مخصوص تھا۔

﴿وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝۸۳﴾ ''اور یہ ان ظالموں سے کوئی زیادہ دور نہیں۔''

یعنی مشرکین مکہ سے قومِ لوطؑ کی یہ بستیاں زیادہ دور نہیں ہیں۔ قریش کے قافلے جب فلسطین کی طرف جاتے تھے تو پہلے قومِ ثمود اور قومِ مدین کے علاقے سے گزرتے تھے' پھر قومِ لوط کی بستیوں کے آثار بھی اُن کے راستے میں آتے تھے۔

آیات ۸۴ تا ۹۵

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ
وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ
يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝۸۴ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۸۵ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝۸۶ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ
نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ
الرَّشِيْدُ ۝۸۷ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ
رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا
الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ
اُنِيْبُ ۝۸۸ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْۤ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ
اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ۝۸۹ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ
ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا

تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ؗ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا
بِعَزِيْزٍ ۝۹۱ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ
ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۹۲ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ
عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ
وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝۹۳ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ
جٰثِمِيْنَ ۝۹۴ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۝۹۵

آیت ۸۴ ﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ﴾ ''اور مدین کی طرف (ہم نے بھیجا) ان کے بھائی شعیبؑ کو۔''

اس قوم کے بارے میں ہم سورۃ الاعراف کے مطالعہ کے دوران پڑھ چکے ہیں کہ یہ لوگ بنی قطورہ میں سے تھے اور خلیج عقبہ کے داہنی (مشرقی) طرف کے علاقہ میں آباد تھے۔ اس علاقہ میں یہ لوگ ایک بڑی مضبوط قوم بن کر ابھرے تھے۔ یہ علاقہ اُس وقت کی دو بہت اہم بین الاقوامی شاہراہوں کے مقامِ انقطاع (intersection) پر واقع تھا۔ ایک شاہراہ شمالاً جنوباً تھی جو شام سے یمن جاتی تھی اور دوسری شرقاً غرباً تھی جو عراق سے مصر کو جاتی تھی۔ چنانچہ تمام تجارتی قافلے یہیں سے گزرتے تھے جس کی وجہ سے یہ علاقہ اس زمانے کا بہت بڑا تجارتی مرکز بن گیا تھا۔ نتیجتاً یہاں کے لوگ بہت خوشحال ہو گئے تھے' مگر ساتھ ہی ناپ تول میں کمی اور راہزنی جیسے قبیح جرائم میں بھی ملوث تھے۔

﴿قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾ ''آپؑ نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو' تمہارا کوئی معبود نہیں اُس کے سوا۔''

﴿وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ﴾ ''اور نہ کم کرو ماپ اور تول کو'

﴿اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝۸۴﴾ ''میں تمہیں آسودہ حال دیکھتا ہوں' لیکن (اگر تم لوگ ان غلط کاریوں سے باز نہ آئے تو) مجھے اندیشہ ہے تم پر ایک ایسے دن کے عذاب کا جو تمہیں گھیر لے گا۔''

آیت ۸۵ ﴿وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ﴾ ’’اور اے میری قوم کے لوگو! پورا پورا دیا کرو پیمانہ اور تول‘ عدل اور انصاف کے ساتھ‘‘

﴿وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٨٥﴾﴾

’’اور مت کم دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ ہی زمین میں فساد مچاتے پھرو۔‘‘

آیت ۸۶ ﴿بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ﴾ ’’اللہ کی عطا کردہ بچت ہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مؤمن ہو۔‘‘

انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی کر کے ان کی حق تلفی نہ کیا کرو۔ اگر تم لوگ دیانتداری سے تجارت کرو‘ اور اس طرح اللہ تعالیٰ تمہیں جو منافع عطا کریں‘ اسی پر قناعت کرو تو یہ تمہاری دنیا و آخرت کے لیے بہت بہتر ہوگا۔

﴿وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿٨٦﴾﴾ ’’لیکن میں تمہارے اوپر کوئی نگران نہیں ہوں۔‘‘ میں تو تمہیں سمجھا سکتا ہوں‘ نیکی کی تلقین کر سکتا ہوں‘ تم پر میرا کوئی زور نہیں ہے۔

آیت ۸۷ ﴿قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ﴾ ’’انہوں نے کہا: اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں ان کو جن کو پوجتے آئے ہیں ہمارے آباء واَجداد؟‘‘

اگرچہ حضرت شعیب علیہ السلام کی گفتگو میں ان کے شرک کا تذکرہ نہیں ہے‘ مگر اُن کے اس جواب سے معلوم ہوا کہ وہ بنیادی طور پر اس مرضِ شرک میں بھی مبتلا تھے جو تمام گمراہ قوموں کا مشترک مرض رہا ہے۔

﴿اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ﴾ ’’یا (تمہاری نماز یہ سکھاتی ہے کہ) ہم اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟‘‘

یعنی ہماری ملکیت میں جو سامان اور مال ہے کیا ہم اس کے استعمال میں بھی اپنی مرضی نہیں کر سکتے؟ یہ وہی تصور ہے جو آج کے جدید زمانے میں sacred right of ownership کے خوبصورت الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے‘ جبکہ اسلام میں ملکیت کا ایسا تصور نہیں ہے۔ اسلام کی رو سے ہر چیز کا مالک اللہ ہے اور دنیا کا یہ مال اور ساز و سامان انسانوں کے پاس اللہ کی امانت ہے‘ جس میں اللہ کی مرضی کے خلاف تصرف کرنے کی اجازت نہیں

ہے۔ لہٰذا اسلام ملکیت کے کسی ’’مقدس حق‘‘ کو تسلیم نہیں کرتا‘ کیونکہ: ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
درحقیقت مالکِ ہر شے خداست

یعنی یہ مال و دولت ہمارے پاس چند دن کی امانت ہے‘ ورنہ حقیقت میں ہر شے کا مالک حقیقی تو اللہ ہی ہے۔ بہرحال جب انسان خود کو مالک سمجھتا ہے تو پھر وہ وہی کچھ کہتا ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا کہ ہمارا مال ہے‘ ہم جیسے چاہیں اس میں تصرف کریں!

﴿اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿٨٧﴾﴾ ’’ہاں ایک تم ہی تو ہو جو بڑے باوقار اور نیک چلن ہو!‘‘

قوم کا حضرت شعیب علیہ السلام کو حلیم اور رشید کہنا کسی تعظیم اور تکریم کے لیے نہیں تھا‘ بلکہ طعن اور استہزا کے طور پر تھا۔

آیت ۸۸ ﴿قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ﴾ ’’آپؑ نے فرمایا: اے میری قوم کے لوگو! ذرا سوچو کہ اگر میں (پہلے بھی) اپنے رب کی طرف سے بیّنہ پر تھا‘‘

حضرت شعیب علیہ السلام نے وہی بات فرمائی جو دوسرے انبیاء و رسل اپنی اپنی قوم سے فرماتے آئے تھے کہ تمہارے درمیان رہتے ہوئے میرا کردار اور اخلاق پہلے بھی مثالی تھا‘ میں اس معاشرے میں ایک شریف النفس اور سلیم الفطرت انسان کے طور پر معروف تھا۔

﴿وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ﴾ ’’اور اللہ نے اپنے پاس سے مجھے اچھا رزق بھی عطا کیا ہے‘‘

یعنی پھر مجھے اللہ نے نبوت اور رسالت سے بھی سرفراز فرما دیا ہے۔

﴿وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ﴾ ’’اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ جس چیز سے تم لوگوں کو منع کروں خود وہی کام کروں۔‘‘

﴿اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ﴾ ’’میں تو کچھ نہیں چاہتا سوائے اصلاح کے جس قدر مجھ میں استطاعت ہے‘ اور میری توفیق تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔‘‘

میرا مقصد تم لوگوں کی اصلاح ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں وہ اللہ کی

توفیق ہی سے کر رہا ہوں۔ اسی نے مجھے ہمت اور استقامت سے نوازا ہے۔

﴿عَلَیۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَیۡهِ اُنِیۡبُ ﴿۸۸﴾﴾ ''اُسی پر میں نے توکّل کیا ہے اور اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں''۔

آیت ۸۹ ﴿وَیٰقَوۡمِ لَا یَجۡرِمَنَّكُمۡ شِقَاقِیۡۤ اَنۡ یُّصِیۡبَكُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ قَوۡمَ هُوۡدٍ اَوۡ قَوۡمَ صٰلِحٍ ؕ﴾ ''اور اے میری قوم کے لوگو! (دیکھو) میری دشمنی تمہیں اس انجام تک نہ لے جائے کہ تم پر بھی وہی عذاب آ جائے جیسا کہ آیا تھا قومِ نوحؑ، قومِ ہودؑ یا قومِ صالحؑ پر''۔

﴿وَمَا قَوۡمُ لُوۡطٍ مِّنۡكُمۡ بِبَعِیۡدٍ ﴿۸۹﴾﴾ ''اور قومِ لوطؑ تو تم سے زیادہ دُور بھی نہیں ہے''۔

حضرت شعیب علیہ السلام سے پہلے ان چار قوموں پر عذابِ استیصال آ چکا تھا۔ اور یہ جو فرمایا گیا کہ قوم لوط تم سے ''بعید'' نہیں ہے' یہ زمانی اور مکانی دونوں اعتبار سے ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے خلیج عقبہ کے مشرقی ساحل سے متصل علاقے میں قومِ مدین آباد تھی۔ اس علاقے سے ذرا ہٹ کر مشرق کی جانب بحیرۂ مردار ہے جس کے ساحل پر عامورہ اور سدوم کی وہ بستیاں تھیں جن میں حضرت لوط علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ زمانی اعتبار سے بھی ان دونوں اقوام میں ہزاروں سال کا نہیں بلکہ صرف چند سو سال کا بُعد تھا۔ بہرحال مجھے ان مفسرین سے اختلاف ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں مجھے ان علماء کی رائے سے اتفاق ہے جن کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں جس شخص کے مہمان بنے تھے اور جن کی بیٹی کے ساتھ بعد میں آپؑ نے نکاح کیا تھا وہ مدین کے اُن لوگوں کی نسل سے کوئی نیک بزرگ تھے جو حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ عذابِ استیصال سے بچ گئے تھے۔

دوسرا اہم نکتہ اس آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ بعض اوقات کسی داعی کے ساتھ ذاتی عناد اور دشمنی کی بنیاد پر کوئی شخص یا کوئی گروہ اس کی اصولی دعوت کو بھی ٹھکرا دیتا ہے۔ یہ انسانی رویے کا ایک بہت خطرناک پہلو ہے کیونکہ اس میں اس داعی کا تو کوئی نقصان نہیں ہوتا مگر صرف ذاتی تعصب کی بنیاد پر اس کی دعوت کو ٹھکرانے والے خود کو برباد کر لیتے ہیں۔

آیت ۹۰ ﴿وَاسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡهِ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ رَحِیۡمٌ وَّدُوۡدٌ ﴿۹۰﴾﴾ ''اور استغفار کرو اپنے رب سے' پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ یقیناً میرا رب رحیم بھی

ہے' محبت فرمانے والا بھی''۔

اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرو اور اُس کی طرف پلٹ آؤ۔ اُس کی عبادت اور اطاعت شعاری اختیار کرو تو تم اس کے دامنِ رحمت کو اپنے لیے وسیع پاؤ گے۔ وہ انتہائی رحم کرنے والا اور اپنی مخلوق سے محبت رکھنے والا ہے۔

آیت ۹۱ ﴿قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ مَا نَفۡقَهُ كَثِیۡرًا مِّمَّا تَقُوۡلُ﴾ ''انہوں نے کہا: اے شعیب! تم جو کچھ کہتے ہو اس میں سے اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں''۔

جب ذہنوں کے سانچے بگڑ جائیں اور سوچوں کے زاویے بدل جائیں تو پھر سیدھی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔

﴿وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِیۡنَا ضَعِیۡفًا ۚ وَلَوۡلَا رَهۡطُكَ لَرَجَمۡنٰكَ ۫ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡنَا بِعَزِیۡزٍ ﴿۹۱﴾﴾ ''اور ہم تو دیکھتے ہیں تمہیں اپنے درمیان ایک کمزور آدمی۔ اور اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تمہیں (کبھی کا) سنگسار کر چکے ہوتے' اور تم ہم پر غالب نہیں ہو''۔

یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ سمجھ لیں کہ جس زمانے میں جو سورت نازل ہوئی ہے اس میں نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پیش آنے والے معروضی حالات کے ساتھ تطابق پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی گزشتہ اقوام کے واقعات جو مختلف سورتوں میں تواتر کے ساتھ بار بار آئے ہیں یہ تکرارِ محض نہیں ہے' بلکہ حضور ﷺ کی دعوت و تحریک کو جس دور میں جن مسائل کا سامنا ہوتا تھا اس خاص دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں ان مسائل کی مناسبت سے پچھلی اقوام کے حالات و واقعات سے وہ باتیں نمایاں کی جاتی تھیں جن میں حضور ﷺ اور اہل ایمان کے لیے راہنمائی اور دلجوئی کا سامان موجود ہوتا۔ چنانچہ آیت زیر نظر میں حضرت شعیب علیہ السلام کے خاندان اور قبیلے کی حمایت کی بات اس لیے ہوئی ہے کہ اِدھر مکہ میں حضور ﷺ کو بھی کچھ ایسے ہی حالات کا سامنا تھا۔ اُس زمانے میں بنو ہاشم کے سردار آپؐ کے چچا ابوطالب تھے جنہیں حضور ﷺ سے بہت محبت تھی اور آپؐ نے اپنے بچپن کا کچھ عرصہ ان کے سایۂ عاطفت میں گزارا تھا۔ انہی کی وجہ سے آپؐ کو پورے قبیلہ بنی ہاشم کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اگر اُس وقت بنو ہاشم کی سرداری کہیں ابولہب کے پاس ہوتی تو آپ ﷺ کو اپنے خاندان اور قبیلہ کی یہ حمایت حاصل نہ ہوتی' اس طرح مشرکینِ مکہ کو آپؐ کے خلاف (معاذ اللہ) کوئی انتہائی اقدام کرنے کا موقع مل جاتا۔ لہٰذا یہاں حالات میں تطابق اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ جس طرح

اللہ تعالیٰ نے آج مکہ میں بنو ہاشم کی حمایت سے محمد رسول اللہ ﷺ کو ایک محفوظ قلعہ مہیا فرما دیا ہے‘ بالکل اسی نوعیت کی حفاظت اُس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو اُن کے خاندان کی حمایت کی صورت میں بھی عطا فرمائی تھی۔

آیت ۹۲ ﴿قَالَ یٰقَوۡمِ اَرَہۡطِیۡۤ اَعَزُّ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ ؕ﴾ ’’آپؑ نے فرمایا: اے میری قوم کے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے؟‘‘

حقیقت میں میرا پشت پناہ تو اللہ ہے۔ تم اللہ سے نہیں ڈرتے‘ لیکن میرے خاندان سے ڈرتے ہو۔ کیا تمہارے نزدیک میرا خاندان اللہ سے زیادہ طاقتور ہے؟

﴿وَ اتَّخَذۡتُمُوۡہُ وَرَآءَکُمۡ ظِہۡرِیًّا ؕ﴾ ’’اور اُس (اللہ) کو تو تم نے اپنی پیٹھوں کے پیچھے ڈال رکھا ہے۔‘‘

یعنی اللہ کو تو تم لوگوں نے بالکل ہی بھلا چھوڑا ہے‘ پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ یہ انسانی نفسیات کا ایک اہم پہلو ہے۔ اگرچہ آج ہم بھی اللہ کو اپنا خالق‘ مالک اور معبود ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ساتھ ہی دنیا اور اس کے جھمیلوں میں اس قدر مگن رہتے ہیں کہ اللہ کا تصور مستحضر نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کاروبارِ دنیا میں حقیقی مُسبّبُ الاَسباب کو بھلا کر اسباب و حقائق (cause and fact) کی منطقی بھول بھلیوں میں گُم رہتے ہیں: ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

یہاں حضرت شعیب علیہ السلام کا اپنے خاندان کے مقابلے میں اللہ کا ذکر کرنا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ لوگ اللہ کو بخوبی جانتے تھے‘ اسی طرح مشرکین مکہ بھی اللہ کو مانتے تھے۔ گویا اللہ کا معاملہ ایسے لوگوں کے نزدیک آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا ہوتا ہے۔ اسی لیے تو حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ تم لوگ میرے خاندان سے ڈرتے ہو مگر اللہ سے نہیں ڈرتے! حضرت شعیب علیہ السلام کے اس جواب میں قریش کے لیے یہ پیغام مضمر ہے کہ تمہیں بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہی جواب ہے۔

﴿اِنَّ رَبِّیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطٌ ﴿۹۲﴾﴾ ’’یقیناً میرا رب تو اُس سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔‘‘

اللہ تمہارا اور تمہارے اعمال کا گھیراؤ کیے ہوئے ہے۔ تم اس کی گرفت سے نکل کر کہیں

نہیں جا سکتے ہو۔

آیت ۹۳ ﴿وَ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ؕ﴾ ’’اور اے میری قوم کے لوگو! تم کرو جو کچھ کر سکتے ہو اپنی جگہ پر‘ میں بھی کر رہا ہوں جو میں (اپنی جگہ پر) کر سکتا ہوں۔‘‘

تم میرے خلاف جو بھی ریشہ دوانیاں کر سکتے ہو‘ جو بھی چالیں چل سکتے ہو اور جو اقدامات بھی کر سکتے ہو کر گزرو۔ اپنے طور پر جو کچھ میں کر سکتا ہوں‘ جو کوشش مجھ سے بن آ رہی ہے میں کر رہا ہوں۔ یہ چیلنج کرنے کا انداز سورۃ الانعام سے چلا آ رہا ہے۔ یہ گویا مکہ کے حالات کے ساتھ تطابق کیا جا رہا ہے۔ مکہ میں حق و باطل کی کشمکش بھی اب انتہا کو پہنچ چکی تھی اور اس کی وجہ سے آپؐ کی طبیعت کے اندر ایک طرح کی بیزاری پیدا ہو چکی تھی کہ اب جو کچھ تم کر سکتے ہو کر لو!

﴿سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ یَّاۡتِیۡہِ عَذَابٌ یُّخۡزِیۡہِ وَ مَنۡ ہُوَ کَاذِبٌ ؕ﴾ ’’عنقریب تم جان لو گے کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کون ہے جو جھوٹا ہے!‘‘

﴿وَ ارۡتَقِبُوۡۤا اِنِّیۡ مَعَکُمۡ رَقِیۡبٌ ﴿۹۳﴾﴾ ’’تم بھی انتظار کرو‘ میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔‘‘

آیت ۹۴ ﴿وَ لَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّیۡنَا شُعَیۡبًا وَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ بِرَحۡمَۃٍ مِّنَّا﴾ ’’پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے نجات دے دی شعیبؑ کو اور اُن لوگوں کو جو آپؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے‘‘

﴿وَ اَخَذَتِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوا الصَّیۡحَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دِیَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ ﴿۹۴﴾﴾ ’’اور ظالموں کو آ پکڑا ایک زبردست کڑک نے‘ تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔‘‘

آیت ۹۵ ﴿کَاَنۡ لَّمۡ یَغۡنَوۡا فِیۡہَا ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّمَدۡیَنَ کَمَا بَعِدَتۡ ثَمُوۡدُ ﴿۹۵﴾﴾ ’’جیسے کہ وہ کبھی ان میں آباد ہی نہیں تھے۔ آگاہ ہو جاؤ‘ پھٹکار ہے مدین پر‘ جیسے کہ ثمود پر پھٹکار ہوئی تھی۔‘‘

اہلِ مدین بھی اللہ تعالیٰ کی پھٹکار کا نشانہ بن کر اُسی طرح ہلاک ہو گئے جیسے قومِ ثمود ہلاک ہوئی تھی۔

اب آخر پر بہت مختصر انداز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

آیات ۹۶ تا ۹۹

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا
اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴿۹۷﴾ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ
فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّیَوْمَ
الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

آیت ۹۶ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾﴾ ’’اور ہم نے بھیجا موسیٰؑ کو اپنی آیات اور واضح سند کے ساتھ۔‘‘

آیت ۹۷ ﴿اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴿۹۷﴾﴾ ’’فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف‘ لیکن انہوں نے فرعون ہی کی پیروی کی۔ حالانکہ فرعون کا معاملہ راستی والا نہیں تھا۔‘‘

آیت ۹۸ ﴿یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ ’’قیامت کے دن وہ آئے گا آگے چلتا ہوا اپنی قوم کے‘‘

دنیا کی طرح قیامت کے دن بھی اسے قیادت کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ وہ آگے آگے ہوگا اور اس کی قوم پیچھے پیچھے آ رہی ہوگی‘ جیسے وہ لوگ دنیا میں اس کے پیچھے چلتے تھے۔

﴿فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾﴾ ’’پھر وہ آگ کے گھاٹ پر انہیں اُتار دے گا۔ اور وہ بہت ہی برا گھاٹ ہے جس پر وہ اتارے جائیں گے۔‘‘

جس طرح جانوروں کا کوئی گروہ پانی پینے کے لیے گھاٹ پر آتا ہے اور اُن کا لیڈر آگے آگے جا رہا ہوتا ہے‘ ایسے ہی فرعون اپنی قوم کو جہنم کے گھاٹ پر لا اُتارے گا۔

آیت ۹۹ ﴿وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾﴾ ’’اور اِس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ بہت ہی برا ہے وہ انعام جو ان کو ملنے والا ہے۔‘‘

آیات ۱۰۰ تا ۱۰۹

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰی نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِیْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ
وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَكَذٰلِكَ
اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰی وَهِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ
وَذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ؕ یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ
نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّسَعِیْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ
فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّشَهِیْقٌ ﴿۱۰۶﴾ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا
شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ
خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ
مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا یَعْبُدُ
اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ ع

آیت ۱۰۰ ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰی نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِیْدٌ ﴿۱۰۰﴾﴾ ’’یہ ہیں اُن بڑی بڑی بستیوں کی کچھ اہم خبریں جو ہم آپؐ کو سنا رہے ہیں‘ ان میں ایسی بھی ہیں جو ابھی قائم ہیں اور ایسی بھی ہیں جو بالکل ختم ہو گئیں۔‘‘

حَصِیْدٌ کا لفظ اس کھیت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کی فصل کاٹ لی گئی ہو۔ فصل کے کٹنے کے بعد کھیت میں جو ویرانی کا منظر ہوتا ہے اس کے ساتھ عذابِ استیصال سے تباہ شدہ بستیوں کو تشبیہ دی گئی ہے۔ پھر ان بستیوں میں کچھ تو ایسی ہیں جن کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے مگر بعض ایسی بھی ہیں جن کے آثار کو باقی رکھا گیا ہے۔ مثلاً قومِ عاد کی آبادیوں کا کوئی نشان تک نہیں ملتا جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ قوم کہاں آباد تھی (اگرچہ حال ہی میں سیٹلائٹ کے ذریعے ان کے شہر اور شدّاد کی جنّت کے کچھ آثار زیرِ زمین ملنے کا دعویٰ سامنے آیا ہے)۔

دوسری طرف قومِ ثمود کے مکانات کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں۔

آیت ۱۰۱ ﴿وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ ’’اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم ڈھایا‘‘

﴿فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ﴾ ’’تو اُن کے کچھ بھی کام نہ آ سکے ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے‘ جب آپؐ کے رب کا حکم آ پہنچا۔‘‘

﴿وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ۝۱۰۱﴾ ’’اور انہوں نے کچھ اضافہ نہیں کیا اُن کے حق میں مگر بربادی ہی کا۔‘‘

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب استیصال کا حکم آ گیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے ان کے کچھ کام نہ آ سکے اور انہوں نے ان کی ہلاکت و بربادی کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا۔

آیت ۱۰۲ ﴿وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) ایسے ہی ہوتی ہے پکڑ آپؐ کے رب کی‘ جب وہ پکڑتا ہے بستیوں کو جبکہ وہ ظالم ہوتی ہیں۔‘‘

جب کسی بستی میں گناہ اور معصیت کا چلن عام ہو جاتا ہے تو وہ گویا ’’ظلم‘‘ کی مرتکب ہو کر عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔

﴿اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝۱۰۲﴾ ’’یقیناً اُس کی پکڑ بڑی دردناک بھی ہے اور بڑی سخت بھی۔‘‘

اللہ کی پکڑ کے بارے میں سورۃ البروج میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝۱۲﴾ ’’یقیناً تیرے رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔‘‘

آیت ۱۰۳ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ﴾ ’’یقیناً اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہوں۔‘‘

﴿ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝۱۰۳﴾ ’’وہ ایک ایسا دن ہے جس میں لوگوں کو جمع کیا جائے گا اور وہ دن ہے پیشی کا۔‘‘

آیت ۱۰۴ ﴿وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝۱۰۴﴾ ’’اور ہم اسے ایک وقتِ معیّن تک کے لیے مؤخر کیے ہوئے ہیں۔‘‘

اُس کے آنے کی ایک گھڑی معین ہے‘ جس کو باقاعدہ گن کر اور حساب لگا کر طے کیا گیا ہے۔

آیت ۱۰۵ ﴿يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ۝۱۰۵﴾ ’’جب وہ دن آ جائے گا تو کوئی متنفس بات نہیں کر سکے گا مگر اللہ کے اِذن سے‘ تو ان (انسانوں) میں سے کچھ شقی ہوں گے اور کچھ سعید۔‘‘

یعنی کچھ انسان بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔

آیت ۱۰۶ ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝۱۰۶﴾ ’’تو وہ لوگ جو بدبخت ہیں وہ آگ میں ہوں گے جس میں انہیں چیخنا ہے اور دھاڑنا ہے۔‘‘

وہ لوگ درد اور کرب کی وجہ سے چیخ و پکار کریں گے اور پھنکارے ماریں گے۔

آیت ۱۰۷ ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۗءَ رَبُّكَ ۭ﴾ ’’اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ رہیں آسمان اور زمین‘ سوائے اُس کے جو تیرا رب چاہے۔‘‘

یہ مقام مشکلات القرآن میں سے ہے۔ یہ قرآن کا واحد مقام ہے جہاں ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ کے ساتھ کچھ استثناآت بھی آئے ہیں۔ جہنم اور جنت کب تک رہیں گی یا جہنمی اور جنتی لوگ ان میں کب تک رہیں گے؟ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ کہ جب تک آسمان و زمین قائم رہیں گے۔ اِس سے مراد ابدیت بھی ہو سکتی ہے اور اس طرح کا کوئی اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاید کبھی کوئی ایسا وقت آئے جب زمین و آسمان کا وہ نظام بدل بھی جائے اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے لے۔ واضح رہے کہ اس ’’زمین و آسمان‘‘ سے مراد بھی موجودہ زمین و آسمان نہیں ہو سکتے‘ اس لیے کہ ازروئے الفاظِ قرآنی یہ تو قیامت کے روز بدل ڈالے جائیں گے اور یہاں قیامت کے بعد پیش آنے والے حالات و واقعات کا ذکر ہو رہا ہے۔ پھر اس میں بھی ایک استثناء بیان کیا گیا ہے: ﴿اِلَّا مَا شَاۗءَ رَبُّكَ ۭ﴾ ’’سوائے اس کے جو تیرا رب چاہے‘‘۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ خود ہی کسی کے عذاب میں تخفیف کرنا چاہے یا کسی کو ایک مدت تک عذاب دے کر جہنم سے نکالنے کا فیصلہ فرمائے تو اسے اس

کا پورا اختیار ہے۔ جزا و سزا کے بارے میں بھی اہلِ سُنّت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اختیار مطلق ہے لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا طے شدہ فیصلہ ہے کہ کفار کے لیے جہنم ابدی ٹھکانہ ہے۔ واللہ اعلم!

﴿اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾﴾ ''بے شک آپؐ کا رب جو ارادہ کرے اسے کر گزرنے والا ہے۔''

آیت ۱۰۸ ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ﴾ ''اور جو لوگ نیک بخت ہوں گے وہ جنت میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش جب تک رہیں آسمان اور زمین‘ سوائے اس کے جو آپؐ کا رب چاہے۔''

﴿عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾﴾ ''یہ ایسی بخشش ہے جو کبھی ختم نہیں ہو گی۔''

ان آیات میں جنت اور جہنم کا جو موازنہ کیا گیا ہے اس میں جنت کے لیے ﴿عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ کے الفاظ اضافی طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ اس طرح کے لفظی فرق و تفاوت کا جب علماء و مفسرین باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں تو ان سے بڑے بڑے فلسفیانہ نکات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جنت اور جہنم کے بارے میں حافظ ابن تیمیہؒ اور شیخ ابن عربیؒ دونوں نے ایک رائے پیش کی ہے جو اہل سنت کے عام اجماعی عقیدے سے مختلف ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے درمیان اگرچہ بڑا نظریاتی بُعد ہے (امام ابن تیمیہؒ بعض اوقات شیخ محی الدین ابن عربی پر تنقید کرتے ہوئے بہت سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں) مگر اس رائے میں دونوں کا اتفاق ہے کہ جنت تو ابدی ہے مگر جہنم ابدی نہیں ہے۔ ایک وقت آئے گا‘ چاہے وہ اربہا سال کے بعد آئے‘ جب جہنم ختم کر دی جائے گی۔ اس کے برعکس اہل سنت کا اجماعی عقیدہ یہی ہے کہ جنت اور جہنم دونوں ابدی ہیں۔ واللہ اعلم!

آیت ۱۰۹ ﴿فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَاۗءِ ۭ﴾ ''پس (اے نبیﷺ!) آپ کسی شک میں نہ رہیں ان کے بارے میں جن کی یہ لوگ پوجا کر رہے ہیں۔''

﴿مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ﴾ ''یہ لوگ نہیں پوجا کر رہے ہیں مگر ایسے ہی جیسے کہ ان کے آباء و اجداد پُوجا کرتے رہے ہیں اس سے پہلے۔''

یہ تو بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔

﴿وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾﴾ ''اور یقیناً ہم اُن کو دینے والے ہیں اُن کا حصہ بغیر کسی کمی کے۔''

آیات ۱۱۰ تا ۱۲۳

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ
لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ
رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ
مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ
السَّـيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ
الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ
اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ
وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا
يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ
رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ
مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاۗءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ
وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰي
مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ۙ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

آیت ۱۱۰ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ﴾ ''اور موسٰیؑ کو ہم نے کتاب دی تھی پھر اس میں اختلاف پیدا کر دیے گئے۔''

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ﴾ ''اور اگر طے نہ ہو چکی ہوتی ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی سے تو ان کے مابین فیصلہ کر دیا جاتا۔''

﴿وَاِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۱۰﴾﴾ ''اور (اب تو) یہ لوگ اس (تورات) کے بارے میں الجھا دینے والے شک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔''

یہ بات سورۃ الشوریٰ میں وضاحت سے بیان کی گئی ہے کہ ہر رسول کی اُمت اپنی الہامی کتاب کی وارث ہوتی ہے۔ پھر جب اس امت پر زوال آتا ہے تو اپنی اس کتاب کے بارے میں بھی ان کے ہاں شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں کہ واقعتاً یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے بھی یا نہیں!

آیت ۱۱۱ ﴿وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ﴾ ''اور (اے نبیﷺ!) آپ کا رب ان سب کو ان کے اعمال کا لازماً پورا پورا بدلہ دے گا۔''

﴿اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۱۱﴾﴾ ''یقیناً وہ باخبر ہے اس سے جو عمل یہ لوگ کر رہے ہیں۔''

آیت ۱۱۲ ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ﴾ ''تو (اے نبیﷺ!) آپ ڈٹے رہیں جیسا کہ آپ کو حکم ہوا ہے اور وہ بھی جنہوں نے توبہ کی ہے آپ کے ساتھ''

آپﷺ کے ساتھ وہ لوگ بھی صبر واستقامت کے ساتھ ڈٹے رہیں جو شرک سے باز آئے ہیں‘ جنہوں نے کفر کو چھوڑا ہے اور آپؐ کے ساتھ ایمان لائے ہیں۔

﴿وَلَا تَطْغَوْا ؕ﴾ ''اور تم لوگ حد سے تجاوز نہ کرو۔''

تجاوز کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ منکرین حق پر جلد عذاب لے آنے کی خواہش کریں اور یہ بھی کہ چاروں طرف سے ان لوگوں کی مخالفت کے سبب کسی لمحے غصے میں آجائیں اور حلم و بردباری کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں۔

﴿اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱۲﴾﴾ ''یقیناً وہ تم لوگوں کے سب اعمال دیکھ رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال بھی دیکھ رہا ہے اور جو کچھ تمہارے مخالفین کر رہے ہیں ان کی تمام حرکتیں بھی اس کے علم میں ہیں۔ اس لیے اس کے ہاں سے تمہیں تمہارا اجر وثواب ملے گا‘ اور اُن لوگوں کو ان کے کرتوتوں کی سزا ملے گی۔

آیت ۱۱۳ ﴿وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ ''اور کوئی جھکاؤ پیدا نہ کرنا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا''

یہ خالص حق اور باطل کی کش مکش ہے‘ اس میں کہیں کوئی رشتہ داری کا معاملہ‘ کوئی پرانے مراسم‘ قبیلے کی محبت وغیرہ عوامل تم لوگوں کو کسی لمحے ان کی طرف جھکنے پر مائل نہ کریں۔

﴿فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾﴾

''(اگر ایسا ہوا) تو تمہیں آگ پکڑ لے گی‘ پھر تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی نہیں ہوں گے‘ پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔''

آیت ۱۱۴ ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ﴾ ''اور (اے نبیﷺ!) نماز کو قائم رکھیے دن کے دونوں سروں پر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں۔''

دن کے دونوں سروں پر فجر اور عصر کے اوقات ہیں جبکہ رات میں مغرب اور عشاء شامل ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ پانچ نمازوں کا موجودہ نظام گیارہ نبویؐ میں معراج کے بعد قائم ہوا ہے۔ اس سے پہلے مکی دور میں تقریباً ساڑھے دس برس تک نمازوں کے بارے میں جو احکام نازل ہوئے وہ اسی نوعیت کے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیں کہ حضورﷺ سے اس انداز میں صیغۂ واحد میں جو خطاب کیا جاتا ہے‘ وہ دراصل آپﷺ کی وساطت سے امت کو حکم دینا مقصود ہوتا ہے۔

﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰی لِلذّٰكِرِیْنَ ﴿۱۱۴﴾﴾ ''یقیناً نیکیاں بدیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ یاد دہانی ہے یاد رکھنے والوں کے لیے۔''

آیت ۱۱۵ ﴿وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۱۵﴾﴾ ''اور صبر کیجیے‘ یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

آیت ۱۱۶ ﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِیَّةٍ یَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِی الْاَرْضِ﴾ ''تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں حق کے ایسے علمبردار ہوتے جو (اپنی اپنی قوموں کے لوگوں کو) روکتے زمین میں فساد مچانے سے''

﴿اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْهُمْ ۚ﴾ ''مگر بہت تھوڑے لوگ ایسے تھے‘ جنہیں ہم

نے اُن میں سے بچالیا۔''

یہ بات قرآن میں بار بار دہرائی گئی ہے کہ حق کے علمبردار' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ادا کرنے والے لوگ جہاں بھی ہوں' جس قوم سے بھی ہوں' اللہ تعالیٰ ہمیشہ انہیں اپنی رحمت خاص سے بچالیتا ہے۔

﴿وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ﴿۱۱۶﴾﴾ ''اور پیچھے پڑے رہے وہ ظالم ان عیش و آرام کی چیزوں کے جو انہیں دی گئی تھیں اور وہ مجرم تھے۔''

آیت ۱۱۷ ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ﴿۱۱۷﴾﴾ ''اور آپؐ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک کر دے جبکہ ان میں بسنے والے لوگ اصلاح کرنے والے ہوں۔''

ایسا نہیں ہوتا کہ کسی علاقے' کسی ملک یا شہر میں اچھے کردار کے حامل' اپنی اور دوسروں کی اصلاح میں سرگرم لوگوں کی اکثریت ہو اور اللہ پھر بھی اس بستی پر عذاب بھیج دے۔

آیت ۱۱۸ ﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ﴿۱۱۸﴾﴾ ''اور اگر آپؐ کا رب چاہتا تو تمام نوعِ انسانی کو ایک ہی اُمت بنا دیتا' لیکن وہ تو اختلاف کرتے ہی رہیں گے۔''

جہاں کہیں بھی لوگ اکٹھے مل جل کر رہ رہے ہوں گے ان میں اختلافِ رائے کا ہونا بالکل فطری بات ہے۔ مختلف لوگوں کی مختلف سوچ ہے' ہر ایک کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے اور اس کے لیے اپنا اپنا استدلال ہے۔ اسی کے مطابق ان کے نظریات ہیں اور اسی کے مطابق ان کے اعمال و افعال۔ جب تک یہ استدلال علم اور قرآن و سنت کی بنیاد پر ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں' بشرطیکہ یہ اختلاف کی حد تک رہے اور تفرقہ کی صورت اختیار نہ کرے اور ''من دیگرم تو دیگری'' والا معاملہ نہ ہو۔

اس نکتہ کو یوں بھی سمجھنا چاہیے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما دونوں نے قرآن و سنت سے استدلال کیا ہے' مگر بعض اوقات دونوں بزرگوں کی آراء میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر ایسے اہل علم حضرات کے ہاں ایسا اختلاف کبھی بھی نزاع اور تفرقہ بازی کا باعث نہیں بنتا۔ ایک دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو دنیا کی رونق اور خوبصورتی بھی اسی تنوع اور اختلاف سے قائم ہے۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے!

اگر دنیا میں یکسانیت (monotany) ہی ہو تو انسان کی طبیعت اس سے اکتا جائے۔

آیت ۱۱۹ ﴿اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ﴾ ''سوائے اُس کے کہ جس پر آپؐ کا رب رحم فرمادے۔ اور اسی لیے اُس نے انہیں پیدا کیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تخلیق کے اندر یہ اختلاف اور تنوع خود رکھا ہے۔ دنیا میں اربوں انسان ہیں مگر ان میں کوئی سے دو انسانوں کے مزاج' شکل و صورت اور آواز حتیٰ کہ انگلیوں کے نشانات آپس میں نہیں ملتے۔ لہٰذا اللہ انسانوں کو پیدا ہی اسی انداز پر کرتا ہے کہ ان میں تنوع اور انفرادیت قائم رہے۔ ایک حدیثِ نبویؐ کی رو سے انسان بھی معدنیات کی طرح ہیں۔ چنانچہ جس طرح معدنیات کی بے شمار اقسام ہیں مگر ہر ایک کی اپنی خصوصیات اور اپنی پہچان ہے' یہی معاملہ انسانوں کا ہے۔

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴿۱۱۹﴾﴾ ''اور آپؐ کے رب کی یہ بات پوری ہو کر رہے گی کہ میں جہنم کو جنوّں اور انسانوں سب سے بھر کر رہوں گا۔''

یعنی تمام مشرک' سرکش' نافرمان اور گناہگار جنوں اور انسانوں کو اکٹھا کر کے جہنم کا ایندھن بناؤں گا اور یوں ان سے جہنم کو بھر دوں گا۔ اُس نے جنت بنائی ہے تو اسے بھی آباد کرنا ہے اور جہنم بنائی ہے تو اُسے بھی ایندھن فراہم کرنا ہے۔

آیت ۱۲۰ ﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) ہم رسولوں کی خبروں میں سے ہر ایک آپ کو سنا رہے ہیں''

یہ ''انباء الرسل'' کی وہی اصطلاح ہے جس کا ذکر قبل ازیں بار بار ہوا ہے۔ حضرت نوح' حضرت ہودؑ حضرت صالحؑ' حضرت لوطؑ' حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کے حالات ہم آپؐ کو بار بار اس لیے سنا رہے ہیں:

﴿مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ﴾ ''(تاکہ) مضبوط رکھیں ہم اس کے ساتھ آپؐ کا دل۔''

تاکہ ان واقعات کو سن کر آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے دلوں میں اطمینان بڑھے اور استقامت میں اضافہ ہو۔ ان واقعات کے ذریعے سے ہم یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مکہ

میں آپ پر اور آپؐ کے ساتھیوں پر مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں‘ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے‘ بلکہ جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف مبعوث ہوا اور اسے دعوتِ حق پیش کی تو اس کی مخالفت اسی شدومد سے ہوئی۔ انبیاء ورسل اور ان کے ساتھیوں کو ہمیشہ ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر جس طرح ہم نے ہر بار اہل حق کی مدد کی اور بالآخر کامیاب وہی ہوئے‘ اسی طرح اب بھی حق و باطل کی اس جاں گسل کشمکش میں بول بالا حق ہی کا ہوگا‘ اور آخر کار فتح آپؐ کی اور آپؐ کے ساتھیوں ہی کی ہوگی۔

﴿وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٢٠﴾﴾ ’’اور اس میں آپؐ کے پاس حق آیا ہے اور مؤمنین کے لیے اس میں نصیحت اور یاددہانی ہے‘‘۔

یعنی اس قرآن میں یا اس سورت میں یا ان واقعات میں حق اور باطل کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے اور مؤمنین کے لیے نصیحت اور یاددہانی کا سامان بھی فراہم کر دیا گیا ہے۔

آیت ۱۲۱ ﴿وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿١٢١﴾﴾ ’’اور کہہ دیجیے ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ پر کرو (جو کر سکتے ہو) ہم بھی کر رہے ہیں (جو کچھ ہم کر سکتے ہیں)‘‘۔

یعنی تم میری مخالفت اور دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرو‘ اس ضمن میں جو کر سکتے ہو بے شک میرے خلاف کر گزرو‘ تم اپنے طریقے پر چلتے رہو‘ ہم اپنی روش پر چلتے رہیں گے۔

آیت ۱۲۲ ﴿وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٢٢﴾﴾ ’’اور تم بھی انتظار کرو‘ ہم بھی منتظر ہیں‘‘ کہ اللہ کی طرف سے آخری فیصلہ کیا آتا ہے۔

آیت ۱۲۳ ﴿وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ﴾ ’’اور اللہ ہی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کی تمام چھپی چیزیں اور کُل کا کُل معاملہ اُسی کی جانب لوٹا دیا جائے گا‘‘۔

﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٣﴾﴾ ’’تو آپؐ اُسی کی عبادت کریں اور اُسی پر توکّل کریں۔ اور یقیناً آپؐ کا رب غافل نہیں ہے اس سے جو تم لوگ کر رہے ہو‘‘۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم oo

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے
سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہجِ انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک‘
اسلامی انقلاب کے مراحل‘ مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیمِ اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

صفحات: 375 قیمت اشاعت خاص: 400 روپے اشاعت عام: 200 روپے

’’منہج انقلابِ نبویؐ‘‘ کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

صفحات: 64 قیمت اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 20 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے‘ ماڈل ٹاؤن لاہور‘ فون: 3-35869501

اَکلِ حلال کی اہمیت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

۲۱/ ستمبر ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِھَآ اِلَی الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ (البقرۃ)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم :

((اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ، لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا، وَاِنَّ اللّٰہَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِمَا اَمَرَ بِہِ الْمُرْسَلِیْنَ، فَقَالَ: ﴿یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ط﴾ (المؤمنون:۵۱) وَقَالَ : ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ﴾ (البقرۃ:۱۷۲) ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلَ یُطِیْلُ السَّفَرَ ، اَشْعَثَ اَغْبَرَ ، یَمُدُّ یَدَیْہِ اِلَی السَّمَاءِ : یَا رَبِّ! یَارَبِّ! وَمَطْعَمُہٗ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُہٗ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُہٗ حَرَامٌ، وَغُذِیَ بِالْحَرَامِ ، فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ!)) (۱)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیز ہی قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو وہی حکم دیا ہے جو رسولوں کو دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اے میرے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے عمل کرو''۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے فرمایا ہے: ''اے ایمان والو! ہم نے جو پاکیزہ چیزیں

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا۔

تمہیں دی ہیں ان میں سے کھاؤ''۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر کرے، اس کے بال پراگندہ اور جسم غبار آلود ہو، وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر یارب! یارب! کہے، مگر اس کی حالت یہ ہو کہ اس کا کھانا، پینا، لباس اور غذا ہر چیز حرام ہو تو اس کی دعا کیونکر قبول کی جائے!''

معزز سامعین کرام!

آج ہمارا ''قران السّعدین'' ہو رہا ہے، بایں معنی کہ دو مضمون جڑ رہے ہیں۔ رمضان اور روزے سے متعلق ایک اہم بات جو سورۃ البقرۃ کے ۲۳ویں رکوع کی آخری آیت میں بیان ہوئی ہے، آج ہمارے زیر درس ہے اور اربعین نووی کی حدیث ۱۰ جو اسی موضوع سے متعلق ہے، وہ بھی آج ہمارے زیر مطالعہ آئے گی۔

اس حوالے سے یہ بات ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ ارکانِ اسلام میں سے تیسرا رکن ''صوم'' اس اعتبار سے بہت ہی نمایاں ہے کہ اس کے جملہ احکام نہایت اختصار کے ساتھ سورۃ البقرۃ کی چھ مسلسل آیات (۱۸۳ تا ۱۸۸) میں موجود ہیں۔ ان آیات میں روزے کا ابتدائی حکم بھی آ گیا، تکمیلی احکام بھی آ گئے، صوم کی حکمت بھی آ گئی، صوم کے لیے رمضان المبارک کے انتخاب کا سبب بھی آ گیا، اور رمضان المبارک کے حوالے سے قیام اللیل کی جو اضافی عبادت ہے اس کا ذکر بھی ان آیات میں ہو گیا۔ پھر ان سب کا مجموعی حاصل اور آخری منزل بھی انہی آیات میں بیان ہو گئی۔ چنانچہ نوٹ کیجیے کہ پہلی آیت ختم ہوتی ہے: ''لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ'' پر، یعنی تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ تم سے پہلی اُمتوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ تیسری آیت ختم ہوتی ہے: ''لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ'' پر — تاکہ تمہارے اندر قرآن مجید کی عظمت کا صحیح ادراک پیدا ہو جائے اور پھر تم اس کا شکر ادا کر سکو جیسے کہ اس کے شکر کا حق ہے۔ چوتھی آیت ختم ہوتی ہے: ''لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ'' پر — تاکہ وہ ہدایت کی بلندترین منزل ''رشد'' پر فائز ہو جائیں۔ پانچویں آیت پھر لفظ تقویٰ ''لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ'' پر ختم ہوتی ہے۔ یعنی یہ سارے احکام ہم نے تفصیل سے اس لیے بیان کیے ہیں تاکہ لوگ تقویٰ اختیار کر سکیں۔

تقویٰ کا معیار: اَکلِ حلال

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ کا معیار اور اس کی کسوٹی کیا ہے؟ —— یہ لفظ ہمارے ہاں عام استعمال ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص بڑا متقی ہے‘ فلاں بڑا پرہیزگار ہے۔ اس لحاظ سے تقویٰ کا کوئی نہ کوئی تصور ہر شخص اپنے ذہن میں رکھتا ہے —— عام طور پر صورت یہ ہے کہ تقویٰ کو صرف عبادات سے متعلق مانا جاتا ہے اور کسی بھی شخص کے متقی ہونے کا فیصلہ اس اعتبار سے کیا جاتا ہے کہ وہ نماز کتنی پابندی اور کتنے خشوع وخضوع سے پڑھتا ہے‘ روزہ کس اہتمام سے رکھتا ہے‘ زکوٰۃ کے علاوہ اللہ کی راہ میں کتنا کچھ خرچ کرتا ہے اور حج عمرے کتنے کرتا ہے۔ یہ تمام چیزیں گویا تقویٰ کے معیارات ہیں۔ بعض لوگ عبادات کے ساتھ ساتھ انسان کے ظاہر کو بھی تقویٰ کا معیار سمجھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اُس کا لباس‘ وضع قطع اور رہن سہن وغیرہ شریعت کے اصولوں کے کتنے مطابق ہے اور اس سے اتباعِ رسول کا کتنا اظہار ہو رہا ہے —— یہ ساری چیزیں تقویٰ کے حوالے سے ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں۔ لیکن اگر تقویٰ کا پیمانہ یہی مانا جائے تو پھر سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۸ کا بظاہر صوم اور رمضان سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس آیت میں ایک علیحدہ مضمون بیان ہوا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ”اور تم ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے مت کھاؤ!“

اس حوالے سے یہ نوٹ کر لیں کہ اس آیت میں تقویٰ کا معیار‘ اس کی کسوٹی اور اس کا پیمانہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی روزہ اس لیے فرض کیا گیا ہے اور یہ سارے احکام تمہیں اس لیے دیے جا رہے ہیں تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے اور تقویٰ کا لٹمس ٹیسٹ اور معیار ہے: ”اَکلِ حلال“۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر کوئی نیکی نیکی نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ دنیا میں ہم زندگی گزارتے ہیں تو ایک دوسرے سے لین دین ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نے کچھ پیسوں کے عوض کوئی چیز خریدی اور بیچنے والے نے اگر اس خرید وفروخت میں کسی بھی قسم کا دھوکہ کیا یا اس شے کا کوئی نقص چھپایا تو جو پیسے اس چیز کے عوض آپ اُسے دے رہے ہیں وہ اس کے لیے حرام ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ مدینہ کی ایک

منڈی میں تشریف لے گئے تو وہاں گندم کا ایک ڈھیر دیکھا۔ آپ ﷺ نے اس ڈھیر کے اندر اپنا دستِ مبارک داخل کیا تو معلوم ہوا کہ نیچے نم آلود گندم ہے جبکہ اوپر کی گندم خشک ہے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا))(۱) یعنی جس نے اس طرح کی دھوکہ بازی کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ گویا یہ تو سراسر دھوکہ ہے اور کسی شے کا نقص چھپا کر اسے بیچنے سے ایسی کمائی حرام ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ نوٹ کر لیں کہ تقویٰ کا لٹمس ٹیسٹ معاملات کے اندر ہے‘ ورنہ داڑھیوں کا لمبا ہونا اور پائینچوں کا ٹخنوں یا آدھی پنڈلی تک اونچا ہونا تقویٰ کا معیار نہیں ہے۔ تقویٰ کا اصل معیار رزقِ حلال اور اَکلِ حلال ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر نمازوں کے ڈھیر اور نوافل کے انبار بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اصل یہی ہے کہ آپ جو کھا رہے ہیں وہ اصلاً حلال بھی ہو اور پھر جائز وحلال طریقے ہی سے حاصل کیا گیا ہو۔ اب اگر ایک شخص سور کا گوشت کھا رہا ہے تو آپ سب کہیں گے چھی چھی‘ حرام کھا رہا ہے‘ لیکن ایک شخص کھا تو بکری کا گوشت رہا ہے مگر اُس نے وہ گوشت کسی کی جیب کاٹ کر خریدا ہے تو یہ حلال گوشت چونکہ اس نے حرام طریقے سے کمایا ہے تو یہ بھی حرام ہے۔ اس طریقے سے حرام کا سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اس حوالے سے آخری بات جو میں کہا کرتا ہوں‘ ذرا کان کھول کر سن لیجیے کہ ایک ایسے ماحول میں جس میں دینِ حق غالب نہ ہو بلکہ باطل کا نظام رائج ہو‘ اس میں سانس لینا بھی حرام ہے۔ اِلا یہ کہ سانس لینے یا غذا کھانے سے جو قوت پیدا ہوتی ہے اگر اس کا اکثر وبیشتر اس نظامِ باطل کو ختم کر کے نظامِ حق کو قائم کرنے کی جدوجہد میں خرچ ہو رہا ہے تو جائز ہے‘ ورنہ سانس لینا بھی حرام ہے ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا!

بہرحال بیع وشراء میں دھوکہ دینا‘ فریب کرنا‘ اپنے مال کے نقص کو چھپانا حرام ہے اور ان ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی حرام ہے۔

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب قول النبی ﷺ من غشنا فلیس منا۔ وسنن الترمذی‘ ابواب البیوع‘ باب فی کراھیة الغش فی البیوع۔

آیت کے اگلے حصہ میں اکلِ حرام کی ایک خاص صورت بیان کی گئی ہے۔فرمایا: ﴿وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ﴾ ’’تم اپنے مال کو ذریعہ نہ بناؤ حکام تک پہنچنے کا تاکہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ہڑپ کرسکو گناہ کے ساتھ‘‘— ’’دَلو‘‘ کہتے ہیں ڈول کو اور ڈول کنوئیں میں اتارا جاتا ہے پانی کھینچنے کے لیے۔اسی طرح کوئی شخص اپنا مال کسی سرکاری افسر کو اس لیے پیش کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے کسی اور کا مال ہڑپ کرسکے۔اسے عام اصطلاح میں ’’رشوت‘‘ کہا جاتا ہے۔ تو جس طرح پانی تک پہنچنے کے لیے ڈول کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اسی طریقے سے لوگوں کی حق تلفی کرنے یا ان کا مال غلط طریقے پر ہڑپ کرنے کے لیے تم نے اپنے مال کو ڈول بنایا حکام تک پہنچنے کا‘ تاکہ اس کے ذریعے سے ان کے ہاتھ میں موجود اختیارات کو تم اپنے حق میں استعمال کرسکو۔ اسی کا نام رشوت ہے اور ایک حدیث میں صاف طور پر آیا ہے:

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ فِي الْحُكْمِ))(۱) یعنی رسول اللہ ﷺ نے مقدمات میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔رشوت کے ضمن میں ایک حدیث تو بہت مشہور ہے:

((اَلرَّاشِيْ وَالْمُرْتَشِيْ فِي النَّارِ))(۲)

’’رشوت دینے والا اور رشوت کھانے والا دونوں جہنمی ہیں۔‘‘

ہم ’’راشی‘‘ کا لفظ رشوت خور یعنی رشوت لینے والے کے لیے بولتے ہیں‘ جبکہ عربی زبان اور حدیث کی اصطلاح میں ’’راشی‘‘ رشوت دینے والے کو کہتے ہیں۔ اگر آپ گہرائی میں تجزیہ (analysis) کریں تو معلوم ہوگا کہ رشوت کی اصل بنیاد رشوت دینا ہے۔ وہ اس طرح کہ لوگ غلط کام کرانے کے لیے حکام اور سرکاری افسران کو رشوت کی عادت ڈالتے ہیں اور اپنا کام نکلوانے کے لیے اُن کی مٹھیاں گرم کرتے ہیں۔ جب وہ

---

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الاحکام‘ باب ما جاء فی الراشی والمرتشی فی الحکم۔

(۲) الترغیب والترھیب للمنذری ۳/۱۹۴۔ ومجمع الزوائد للھیثمی ۴/۲۰۲‘ رجالہ ثقات۔

رشوت کے عادی ہو جاتے ہیں تو پھر اس کے بغیر وہ کوئی کام کرتے ہی نہیں ہیں اور ایک آسان سے کام کو اتنا پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی رشوت دینی پڑتی ہے۔

عام طور پر لوگ اپنے غلط کام کرانے یا کسی کا حق تلف کرنے کے لیے اپنے مال کو حکام تک پہنچنے کا ذریعہ بنا رہے ہوتے ہیں تاکہ اُن کے اختیارات کے ناجائز استعمال سے کچھ ناجائز آمدنی یا کچھ غیر قانونی مفادات حاصل کرسکیں‘ یا سرکاری محصولات (ٹیکس‘ انکم ٹیکس وغیرہ) میں کمی کرا سکیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا اور آپ میں سے بہت سوں کو تو تجربہ بھی ہوا ہوگا کہ جب نئے نوجوان افسر کسی جگہ چارج لیتے ہیں تو اس وقت ان میں کچھ اصول وقواعد کی پابندی نظر آتی ہے اور ان کی نظر میں دیانت داری اور قوم کے ساتھ خلوص واخلاص بھی کوئی شے ہوتی ہے‘ لیکن اس نظام میں پہلے سے موجود خرانٹ قسم کے افسران اور کرپٹ اہلکاران نوجوان افسروں کو پٹی پڑھاتے ہیں کہ تم تو ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو اور اس طرح تو ترقی کے راستے تم پر بند ہو جائیں گے‘ تم آگے بڑھ نہیں سکو گے۔ جب تک تم اپنے سے اوپر والے حکام کو راضی نہیں رکھو گے تمہاری ترقی کیسے ہوگی؟ دوسرے یہ کہ وہاں موجود حرام خور لوگ انہیں رشوت کے ایسے ایسے طریقے روشناس کراتے ہیں کہ جس سے ان کو رشوت کا چسکا پڑ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی نہیں چھوڑ سکتے ؏ ’’چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی!‘‘

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

آیت کے آخر میں فرمایا گیا:﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٨﴾﴾ ’’اور تم (یہ سب) جانتے بوجھتے کر رہے ہو‘‘۔ یعنی اگر جان بوجھ کر یہ سب کرو گے تو اللہ کے غضب اور اس کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ گے۔ البتہ اگر کبھی غلط فہمی اور لاعلمی کی بنا پر ایسا ہو جائے تو وہ قابل گرفت نہیں ہے‘ مثلاً کوئی شخص غلط فہمی میں نادانستہ طور پر کوئی لقمۂ حرام کھالے یا کوئی اسے دھوکہ سے سُور کا گوشت بکری کا گوشت کہہ کر کھلا دے تو ان صورتوں میں وہ مجرم نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ غلط فہمی اور لاعلمی میں اگر کوئی حرکت ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ مؤاخذہ نہیں — اس حوالے سے سورۃ البقرۃ کی آخری آیت بہت اہمیت کی

حامل ہے جس میں یہ دعا موجود ہے: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ’’اے ہمارے رب! ہم سے مواخذہ نہ فرما اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے‘‘ —لیکن جانتے بوجھتے اگر حرام خوری کا کوئی بھی کام کرو گے تو یہ جان لو کہ تم سے تقویٰ کی نفی ہو جائے گی اور تم عذابِ الٰہی کے مستحق ہو گے۔

حدیث کی تشریح

اب ’’اربعینِ نووی‘‘ کی اس حدیث کی طرف آتے ہیں جو موضوع کی مناسبت سے میں نے شروع میں بیان کی تھی۔ اس حدیث میں اکلِ حلال کی اہمیت اور اس کا مقام و مرتبہ بیان ہو رہا ہے۔ اس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ مسلم شریف کی روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ، لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا)) ’’بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیز ہی قبول کرتا ہے‘‘ — چنانچہ اگر کسی نے عید الاضحیٰ کے موقع پر بیس‘ تیس ہزار کا دنبہ اللہ کی راہ میں قربان کر دیا‘ لیکن وہ تھا حرام کی کمائی سے‘ تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے‘ اس لیے کہ اللہ خود بھی پاک ہے اور وہ سوائے پاک اور حلال چیز کے اور کسی چیز کو قبول نہیں کرتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ (الحج:۳۷) ’’ہرگز نہیں پہنچتا اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور نہ خون لیکن پہنچتا ہے اُس تک تمہارا تقویٰ‘‘ — اور اگر کسی نے اپنی جائز کمائی سے کوئی چھوٹا سا جانور خرید کر بھی اللہ کی راہ میں ذبح کیا تو اس کے ایک ایک بال پر بھی اجر ہے۔ اس حوالے سے ایک بہت پیاری حدیث ہے۔

> حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعض اصحاب نے عرض کیا: یارسول اللہ! ان قربانیوں کی کیا حقیقت ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے‘‘۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے لیے ان قربانیوں کا کیا اجر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’قربانی کے جانور کے ہر ہر بال کے عوض نیکی ہے‘‘۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا اُون کا بھی یہی حساب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’ہاں اون (والے جانور) کے ہر بال کے عوض نیکی ہے‘‘۔(۱)

(۱) سنن ابن ماجہ‘ کتاب الاضاحی‘ باب ثواب الاضحیۃ۔

بنی نوعِ انسان کے پہلے قتل کا سبب

اس حوالے سے یہ بھی نوٹ کر لیں کہ قربانی کی عدمِ قبولیت ہی نوعِ انسانی کے پہلے قتل کا سبب تھی۔ سورۃ المائدۃ کے نویں رکوع میں اس واقعہ کا ذکر موجود ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ﴾ (آیت ۲۷)

’’اور (اے نبی ﷺ!) ان کو پڑھ کر بتایئے آدم کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ‘ جبکہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہو گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی۔‘‘

آدم علیہ السلام کے یہ دو بیٹے ہابیل اور قابیل تھے۔ ہابیل بھیڑ بکریاں چراتا تھا اور قابیل کاشت کار تھا۔ ان دونوں نے اللہ کے حضور قربانی دی۔ ہابیل نے کچھ جانور پیش کیے‘ جبکہ قابیل نے اناج نذر کیا۔ ہابیل کی قربانی قبول ہو گئی مگر قابیل کی قبول نہیں ہوئی — اُس زمانے میں قربانی کی قبولیت کی علامت یہ ہوتی تھی کہ آسمان سے ایک شعلہ نیچے اُترتا تھا اور وہ قربانی کی چیز کو جلا کر بھسم کر دیتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے قربانی کو قبول فرما لیا — قابیل کو اپنی قربانی کی عدمِ قبولیت پر شدید غصہ آیا اور اس نے طیش میں آ کر ہابیل سے کہا: ﴿لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ﴾ ’’میں تمہیں قتل کر کے رہوں گا‘‘۔ اس پر ہابیل نے کہا کہ قربانی قبول اور رد کرنا تو اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے‘ اس میں میرا کیا قصور! البتہ یہ یاد رکھو کہ ﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۷﴾ ’’اللہ تعالیٰ قربانی قبول نہیں کرتا مگر متقیوں سے‘‘۔ یعنی مجھ پر غصہ ہونے کے بجائے تم اپنے گریبان میں جھانکو کہ تمہاری قربانی اللہ نے کیوں رد (reject) کی ہے! اور یہ بھی یاد رکھو کہ:

﴿لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۸ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ ......﴾

’’اگر تم اپنا ہاتھ اٹھاؤ گے مجھے قتل کرنے کے لیے (تب بھی) میں اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا تمہیں قتل کرنے کے لیے۔ مجھے تو اللہ کا خوف ہے جو تمام جہانوں کا

رب ہے۔ بلکہ میں تو یہ چاہوں گا کہ میرا اور اپنا گناہ تم ہی اپنے سر لے لو......‘‘
یعنی اگر تم مجھے بغیر کسی جواز کے قتل کرو گے تو اپنے گناہوں کا بوجھ تو تم نے اٹھانا ہی ہے اس کے ساتھ میرے گناہوں کا بوجھ بھی تم ہی اٹھاؤ گے۔ اس طرح میرا تو کوئی نقصان نہیں ہے (I stand to lose nothing)۔ بہرحال نوعِ انسانی کے پہلے قتل کے پس منظر میں یہی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔ غرضیکہ تمام قولی‘ بدنی اور مالی عبادات —اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبَاتُ— اگر تقویٰ کے ساتھ ہیں تو اللہ کے ہاں قابل قبول ہیں‘ ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

حدیث کا بقیہ حصہ

آگے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَاِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ)) ’’اور اللہ نے اہل ایمان کو بھی وہی حکم دیا ہے جو اُس نے اپنے رسولوں کو دیا ہے‘‘۔ اب یہاں دیکھئے کہ حضور اکرم ﷺ سورۃ المؤمنون کی آیت ۵۱ کا حوالہ دے رہے ہیں: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ﴾ ’’اے میرے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو‘‘۔ یعنی پہلے اکل حلال کا اہتمام کرو‘ پھر تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول ہوں گے۔ اس کے ساتھ آپ ﷺ نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۲ بھی تلاوت فرمائی: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ’’اے ایمان والو! کھاؤ ان پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں‘‘۔

حدیث کا اگلا حصہ تو لرزہ طاری کر دینے والا ہے: ((ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ ، اَشْعَثَ اَغْبَرَ)) ’’پھر آپ ﷺ نے تذکرہ فرمایا ایسے شخص کا جس نے لمبا سفر طے کیا ہے‘ اس کے بال پراگندہ ہیں اور جسم غبار آلود ہے‘‘۔ حدیث میں تو صراحت نہیں ہے‘ لیکن گمان یہ ہے کہ اس سفر سے حج کا سفر مراد ہے۔ کوئی شخص مدینہ منورہ سے حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ جاتا تھا تو اونٹ پر اُسے سات دن مکہ پہنچنے میں لگتے تھے۔ پھر حالت احرام میں احرام کی پابندیاں بھی اس پر لازم ہیں۔ وہ نہاتا بھی نہیں کہ مبادا کوئی بال ٹوٹ جائے اور اس پر دَم لازم آ جائے۔ آپ غور کیجیے کہ ان سات دنوں کے مسلسل

سفر میں اس کا احرام میلا اور بوسیدہ ہو گیا ہو گا‘ بال پراگندہ ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے کہ بالوں میں نہ تو اس نے کوئی تیل ڈالا ہو گا‘ نہ خوشبو ڈالی ہو گی اور نہ ہی انہیں دھویا گیا۔ اُس کا اپنا حال یہ ہو گا کہ وہ مکمل طور پر غبار آلود ہو چکا ہو گا‘ اس لیے کہ وہ تو سارے کا سارا میدانی اور صحرائی علاقہ ہے اور ظاہر بات ہے کہ اونٹوں کا قافلہ جب چلتا ہے تو اگلا اونٹ جو خاک اڑاتا ہے وہ پچھلے اونٹ کی سواری پر آتی ہے۔ اسی طرح گھوڑے جب دوڑتے ہیں تو ان کے سموں سے اڑنے والی خاک بھی سواروں پر ہی آتی ہے۔

قبولیتِ دعا میں بڑی رکاوٹ: اَکلِ حرام

آگے آپ ﷺ نے فرمایا: ((يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَاءِ ، يَا رَبِّ! يَا رَبِّ!)) ’’وہ شخص اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے: ’’اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار!‘‘ — اس حوالے سے میرے سامنے جبل رحمت کا نقشہ آتا ہے۔ جبل رحمت ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس پر جانے کے لیے لوگ بڑی محنت کرتے ہیں اور بہت مشقتیں اٹھاتے ہیں — فرض کیجیے کہ وہ شخص اس کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کھڑا یا ربّ یا ربّ پکار رہا ہے یا مسجد الحرام میں بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے پروردگار کو پکار رہا ہے۔ ((وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ)) ’’اور حال یہ ہے کہ اس کا کھانا‘ پینا‘ لباس اور غذا ہر چیز حرام ہے‘‘۔ ((فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ!)) ’’تو اس شخص کی دعا کیونکر قبول ہو گی؟‘‘

حدیث کے اس آخری حصے کا ماحصل یہ ہے کہ قبولیتِ دعا کے اندر سب سے بڑی رکاوٹ اکل حرام ہے۔ ایسی صورت میں آپ دعا کرتے رہیں‘ اللہ تعالیٰ سنے گا ہی نہیں۔ اس اعتبار سے آپ خود ہی اپنی دُعا کی قبولیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ اپنی آمدن کا جائزہ لیں کہ اس میں کوئی حرام تو شامل نہیں ہے‘ کوئی ناجائز طریقہ تو شامل نہیں ہے‘ کوئی براہِ راست سود کا عنصر تو نہیں ہے۔ جبکہ بالواسطہ سود سے تو نہ میں بچا ہوا ہوں اور نہ آپ بچے ہوئے ہیں‘ کیونکہ ہمارا پورا معاشی نظام سود پر مبنی ہے۔ گندم کا ایک دانہ جو ہم کھاتے ہیں‘ اس میں بھی سود شامل ہے۔ اس

لیے کہ سودی قرضے پر ہی گندم کا بیج خریدا گیا‘ ٹریکٹر خریدا گیا‘ کھاد خریدی گئی‘ الغرض ہر چیز سود پر لی گئی ہے۔ اس طرح اس کے ایک ایک دانے میں سود شامل ہے اور وہ سود لامحالہ میرے اندر بھی جا رہا ہے‘ اس لیے کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی شخص سود سے بچ بھی جائے گا تو سود کے غبار اور دھوئیں سے نہیں بچ سکے گا۔ فرض کیجیے کہ فضا کے اندر گرد و غبار معلق (dust suspension) ہے تو آپ لامحالہ اسے inhale کریں گے۔ ظاہر بات ہے کہ سانس تو آپ کو لینا ہے‘ سانس لینا تو نہیں چھوڑ سکتے‘ ورنہ تو آپ مر جائیں گے۔ اب جب سانس لیں گے تو اس کے ساتھ گرد و غبار لازماً اندر جائے گا‘ آپ کے پاس اس کو روکنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یا یوں سمجھ لیں کہ ہوٹل کی چودھویں منزل پر آگ لگ گئی ہے اور کمروں کے اندر دھواں بھر گیا ہے۔ اب آپ کہاں جائیں گے؟ چودھویں منزل سے چھلانگ لگائیں گے تو آپ کی ہڈیاں چورا چورا ہو جائیں گی۔ اس حال میں بھی آپ سانس لینے پر مجبور ہیں اور وہ دھواں سانسوں کے ذریعے آپ کے پھیپھڑوں میں پہنچ کر رہے گا۔ بالکل اسی طرح بالواسطہ (indirect) سود سے تو آج کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہے‘ البتہ بلاواسطہ (direct) سود آپ کی اپنی مرضی سے ہے‘ اس لیے کہ آپ نے اپنا کاروبار بڑھانے کے لیے برضا و رغبت سودی قرضہ لیا ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ لوگوں کو چاہیے کہ جتنی جمع پونجی ہے اس سے کاروبار کر لیں۔ اگر بہت تھوڑی پونجی ہے تو پھلوں کی چھابڑی یا کوئی ریڑھی لگا لیں‘ اس سے زیادہ پونجی ہے تو کوئی کھوکھا یا بڑی دوکان بنا لیں‘ اور اگر اس سے بھی زیادہ ہے تو پھر امپورٹ ایکسپورٹ کر لیں‘ لیکن رہیں اپنی چادر کے اندر ہی اور اس سے باہر پاؤں نہ پھیلائیں۔ اسی طرح اگر آپ کے پاس چھوٹا سا مکان ہے تو اُسے بڑی عالی شان کوٹھی میں تبدیل کرنے کے لیے سودی قرضہ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ زندگی گزارنے کے لیے سر کے اوپر چھت میسر ہو‘ اتنا ہی کافی ہے۔ آپ نے یہاں ہمیشہ تو نہیں رہنا۔ ایک وقت آئے گا جب آپ کو یہاں سے نکل کر قبر کے اندر جانا پڑے گا۔ اس حوالے سے یہ یاد رکھیں کہ اگر آپ نے

اپنے کاروبار یا گھر کو وسعت دینے کے لیے سودی قرضہ لیا ہے تو یہ آپ کا اپنا فیصلہ اور آپ کی اپنی choice ہے‘ اور آپ کو اس پر کسی نے مجبور نہیں کیا‘ لہٰذا اس پر آپ کی پکڑ ہو گی اور یہ یاد رکھیں کہ اللہ ربّ العزت کی پکڑ بہت سخت ہے۔

حرام کے لیے قطعاً کوئی عذر قابلِ قبول نہیں!

آج کل ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ سود لینے کو اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ریٹائرمنٹ کے بعد کسی کو گریجویٹی ملتی ہے تو وہ اسے ان خطرات کے پیش نظر بینک میں رکھوا دیتا ہے کہ اگر کاروبار کے لیے کسی اور کو رقم دوں گا تو وہ کھا جائے گا اور اگر اپنے گھر میں رکھوں گا تو وہ ختم ہو جائے گی اور رفتہ رفتہ اس کی قیمت بھی کم ہو جائے گی۔ لہٰذا اپنے آپ کو مجبور ظاہر کر کے وہ یہ رقم بینک میں رکھوا دیتا اور پھر گھر بیٹھا سود کھاتا رہتا ہے۔ یہ یاد رکھیں کہ حرام کے لیے قطعاً کوئی عذر قابل قبول نہیں ہے۔ اس ریٹائر شخص کو چاہیے کہ قطعاً ایسا مت کرے‘ اس لیے کہ اس کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ اس رقم کے ختم ہونے سے پہلے نہیں مرے گا۔ اُسے چاہیے کہ اس رقم سے اگر کوئی بڑا کاروبار نہیں کر سکتا تو اپنے مکان کی بیٹھک میں کوئی چھوٹی سی کریانے کی دوکان لگا کر بیٹھ جائے۔ اس سے گزارے کے مطابق مل جائے گا۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو اس کو چاہیے کہ جو کچھ بھی اس کے پاس جمع پونجی ہے اس سے کھائے اور اللہ پر توکّل رکھے۔ اس لیے کہ رزق اللہ کے ذمّے ہے‘ کیا پتا اس کی جمع پونجی کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی موت آ جائے اور اسے اکل حرام کی طرف نہ جانا پڑے۔ سود سے بچنا تو بہر صورت ضروری ہے‘ اس لیے کہ براہِ راست سود کی کوئی بھی شکل کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے۔

حرام کے لیے ویسے تو کوئی عذر قابل قبول نہیں‘ البتہ اگر آدمی کی جان پر بن گئی ہو‘ وہ مر رہا ہو اور سوائے کسی حرام شے کے کھانے کو کچھ میسر نہ ہو تو صرف جان بچانے کی حد تک حرام کھانے کی اجازت ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اس حوالے سے قانون موجود ہے: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (آیت ۱۷۳) ’’پھر جو کوئی مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں‘‘۔ یعنی

اضطرار کی کیفیت اور انتہائی مجبوری کے عالم میں دو شرطوں کی موجودگی میں جان بچانے کی حد تک حرام کھانا جائز ہے۔ اوّلاً یہ کہ حرام کی طرف کوئی دلی تمنا نہ ہو اور دوسرے یہ کہ جان بچانے کے لیے جو کم سے کم مقدار ضروری ہے اس سے آگے نہ بڑھے۔ ان دو شرطوں کے ساتھ جان بچانے کے لیے حرام چیز بھی کھائی جا سکتی ہے‘ لیکن عام حالت میں اگر آپ اپنے کاروبار‘ پیشے اور معاش میں حرام کا کوئی عنصر مستقل طور پر قائم کر لیتے ہیں تو پھر ہماری آج کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اس صورت میں تقویٰ کی نفی (negation) ہو جائے گی۔

ترکِ حرام‘ قبولیتِ اعمال کے لیے شرطِ لازم

جیسے میں نے پہلے بیان کیا کہ تقویٰ کا معیار اور اس کی کسوٹی اکلِ حلال ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر کوئی عبادت‘ کوئی نیکی‘ کوئی خدمت اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس تناظر میں روزے کے ضمن میں بیان کردہ نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان یاد رکھیں:

((مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ))(۱)

’’جس شخص نے (روزے کی حالت میں) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہیں چھوڑا تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔‘‘

اگر ایک شخص روزے کی حالت میں سودی کاروبار کر رہا ہے‘ رشوت لے رہا ہے‘ جھوٹ بول رہا ہے یا لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے تو یہ روزہ نہیں‘ صرف فاقہ کشی ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الْجُوْعُ)) ’’کتنے ہی روزہ رکھنے والے ایسے ہیں جنہیں ان کے روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا‘‘۔ یعنی ان کے لیے کوئی اجر و ثواب ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ روزے میں تو اصلاً حلال چیزیں بھی حرام ہو جاتی ہیں‘ جبکہ ایسے لوگ تو مستقلاً حرام چیزوں مثلاً جھوٹ بولنا‘ رشوت لینا‘ دھوکہ دہی‘ سودی لین دین اور اس طرح کے باقی

(۱) صحيح البخاری‘ کتاب الصوم‘ باب من لم يدع قول الزور والعمل به فی الصوم۔

کاموں کو عین روزے کی حالت میں بھی جاری رکھے ہوئے ہوں تو ظاہر بات ہے کہ یہ روزہ نہیں ہے‘ صرف فاقہ کشی ہے —— روزے کے ایک لازمی جزو ’’قیام اللیل‘‘ کے حوالے سے مندرجہ بالا حدیث کے اگلے حصہ میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ قِيَامِهٖ اِلَّا السَّهَرُ))(۱) ’’اور کتنے ہی راتوں کو قیام کرنے والے ایسے ہیں جن کو رات کے قیام سے سوائے رت جگے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا‘‘ —— اس اعتبار سے تقویٰ درحقیقت مالی معاملات‘ مثلاً بیع و شراء‘ کاروبار اور آمدنی وغیرہ میں ہوتا ہے۔ جب تک یہ معاملات حلال و جائز طریقے سے نہ ہوں گے اس وقت تک ظاہر بات ہے تقویٰ نہیں ہوگا۔

تقویٰ کا عام فہم مفہوم

تقویٰ کی تعریف کے حوالے سے میں آپ کو ایک بہت پیارا واقعہ سنائے دیتا ہوں۔ ایک موقع پر حضرت عمر فاروق ؓ کی مجلس شوریٰ میں یہ بات زیر بحث آ گئی کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں اور تقویٰ کی جامع اور مانع تعریف کیا ہوگی۔ اس پر بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی آراء کا اظہار کیا‘ لیکن حضرت اُبی بن کعب ؓ خاموش بیٹھے رہے —— یہ وہ صحابی ہیں جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے صحابہ میں قرآن کا سب سے بڑا عالم اور قاری اُبی بن کعب ہے —— تو حضرت عمرؓ نے کہا: اُبی! آپ نے کچھ نہیں کہا‘ آپ بتائیں تقویٰ کسے کہتے ہیں۔ اس پر انہوں نے تقویٰ کی وضاحت جس انداز میں فرمائی اس کا مفہوم کچھ یوں ہے: امیر المؤمنین! اگر کسی شخص کو کسی گھنے جنگل میں سے گزرنا پڑے اور وہاں نہ کوئی پگڈنڈی ہو‘ نہ کوئی راستہ ہو‘ بلکہ اوپر کانٹے دار جھاڑیاں اور درخت ہوں اور نیچے اونچی اونچی گھاس ہو۔ ایسے میں انسان بہت چوکنا ہو کر پھونک پھونک کر قدم رکھے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو یا کسی اور موذی جانور کا بل یا بھٹ ہو اور وہاں پاؤں پڑ جائے —— آپ کو

(۱) سنن ابن ماجه‘ کتاب الصيام‘ باب ما جاء فی الغيبة والرفث للصائم۔ ومسند احمد‘ ح۹۳۰۸‘ راوی: حضرت ابوہریرہ ؓ۔

معلوم ہے کہ ایمیزون یا کانگو جیسے گھنے جنگلات میں تو درختوں سے لٹکے ہوئے سانپ بھی موجود ہوتے ہیں۔ ان جنگلات میں سے اگر کسی کو گزرنا ہو تو وہ کس طرح چوکنا ہو کر اور احتیاط کے ساتھ وہاں پاؤں رکھے گا—— درحقیقت انسان کا اپنی پوری زندگی معصیتِ الٰہی سے بچنا‘ گناہوں سے بچنا‘ اللہ کی نافرمانی سے بچنا‘ حدودِ شریعت تجاوز کرنے سے بچنا اور تمام خرافات‘ رسومات و بدعات سے بچنا تقویٰ کہلاتا ہے۔

دُنیوی زندگی: ایک مسافر خانہ

اس پہلو سے درحقیقت یہ زندگی ایک سفر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ))(۱)

’’دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ تم اجنبی ہو یا راستے سے گزرنے والے (مسافر)۔‘‘

اس حدیث میں دنیا کی زندگی میں دو انداز اختیار کرنے کی نصیحت فرمائی گئی ہے‘ ایک اجنبی کا اور دوسرے مسافر کا۔ اور یہ دونوں انداز بہت قابل غور ہیں۔ اصل میں ہم دیکھتے ہیں کہ عام لوگوں کی دلچسپیاں کیا ہیں‘ لوگ کدھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ہر ایک کو دنیا کی پڑی ہوئی ہے‘ ہر کوئی بہتر سے بہتر مکان‘ عالی شان محل‘ نئے ماڈل کی کار‘ الغرض دنیوی لحاظ سے اعلیٰ سے اعلیٰ تر کی تلاش و جستجو میں ہے۔ اس صورتحال میں ایک آدمی اگر ایسا ہو جو حق پر چلنے والا ہو اور جس نے اپنے آپ کو دین اسلام کے لیے وقف کر دیا ہو‘ ظاہری بات ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان دنیاداروں کے ماحول میں اجنبی پائے گا۔

دوسری بات اس حدیث میں یہ فرمائی گئی ہے کہ یا پھر اس دنیا میں ایسے رہو کہ جس طرح راستہ گزرنے والا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو راستے سے قطعاً کوئی پیار نہیں ہوتا‘ اس لیے کہ اس کی نظر میں اصل چیز منزل ہے جہاں اسے پہنچنا ہے اور راستہ تو بس اس منزل تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک چٹائی پر آرام فرما تھے۔ جب آپؐ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب قول النبی ﷺ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔ وسنن الترمذی‘ ابواب الزھد‘ باب ما جاء فی قصر الامل۔

اُٹھ کر کھڑے ہوئے تو آپؐ کے پہلو مبارک پر چٹائی کے نشانات تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپ کے لیے ایک بچھونا تیار کرا دیں؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَالِیْ وَمَا لِلدُّنْیَا‘ مَا اَنَا اِلَّا فِی الدُّنْیَا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا)) (۱)

’’مجھے اس دنیا سے کیا سروکار! میں تو دنیا میں ایسے ہی ہوں جیسے ایک سوار کسی درخت کے سائے میں تھوڑی دیر کے لیے رکتا ہے‘ پھر وہ ذرا آرام کرنے کے بعد اسے چھوڑ کر چل دیتا ہے۔‘‘

یہ درخت نہ تو اس سوار کا ٹھکانہ ہے اور نہ ہی اسے یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ یہی حیثیت ہمارے لیے دنیا کی ہے‘ بایں صورت کہ ہماری منزل دنیا نہیں کچھ اور ہے۔ اس لیے دنیا میں تو عام چھت کے سائے کو بھی بہت غنیمت سمجھو اور عالی شان محلات کی آرزوئیں دماغ سے نکال دو‘ دنیا کی چیزوں کی طلب دل سے باہر کر دو۔ سمندر میں کشتی پانی پر چلتی ہے‘ لیکن اگر یہ پانی کشتی میں آ جائے تو وہ ڈوب جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا کو بھی سمندر سمجھو جس میں تمہاری کشتی چلتی ہے‘ لیکن اس کی محبت‘ اس کی آرزو‘ اس کی تمنا تمہارے دل میں نہ آنے پائے‘ ورنہ تم ڈوب جاؤ گے۔

نبی اکرم ﷺ کی مبارک باد کے مستحق کون؟

اسی حوالے سے ایک اور اہم حدیث ملاحظہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((بَدَاَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا)) (۲) ’’اسلام کا جب آغاز ہوا تو وہ غریب (اجنبی) تھا‘‘۔ ظاہر بات ہے کہ اس وقت آپ ﷺ تنہا تھے اور معدودے چند ساتھی تھے‘ تو اسلام اس وقت غریب تھا۔ اس کے بعد ایک وقت آیا کہ اسلام کو اللہ

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الزھد‘ باب ما جاء فی اخذ المال بحقہ۔ وسنن ابن ماجہ‘ کتاب الزھد‘ باب مثل الدنیا۔

(۲) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان ان الاسلام غریباً وسیعود غریبا ...... وسنن الترمذی‘ کتاب الایمان‘ باب ما جاء ان الاسلام بدأ غریبا وسیعود غریبا۔

نے طاقت دی: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ① وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ②﴾ (النصر) ''جب اللہ تعالیٰ کی نصرت اور فتح آ گئی اور آپ نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں''۔ آگے آپ ﷺ نے ایک پیشین گوئی فرمائی: ((وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ غَرِیْبًا)) ''عنقریب اسلام پھر اجنبی ہو جائے گا جیسا کہ وہ پہلے اجنبی تھا'' —— عربی زبان میں فعل مضارع مستقبل اور حال دونوں کے لیے آتا ہے' لیکن جب فعل مضارع پر ''سَ'' یا ''سَوْفَ'' آ جائے تو س سے فعل مضارع صرف مستقبل کے لیے خاص ہو جاتا ہے' جیسے: ﴿سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا﴾ ''عنقریب کہیں گے لوگوں میں سے یہ نادان لوگ کہ کس چیز نے انہیں پھیر دیا ان کے قبلے سے جس پر وہ تھے''۔ اس آیت میں تحویل قبلہ کا حکم آیا ہے اور یہاں فعل مضارع پر ''سَ'' آنے کی وجہ سے زمانہ مستقبل قریب مراد ہو گا —— یہاں بھی فرمایا گیا: ((وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ غَرِیْبًا)) کہ عنقریب اسلام پھر غریب ہو جائے گا جیسا کہ پہلے تھا' تو یہ بھی زمانہ مستقبل قریب کی بات ہے۔

اب جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان غریب نہیں رہے بلکہ امیر سے امیر تر ہوتے چلے گئے' لیکن اسلام خلافت راشدہ کے خاتمے کے ساتھ ہی غریب سے غریب تر ہوتا چلا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا تضاد معلوم ہوتا ہے۔ دورِ بنو اُمیہ اور دورِ بنو عباس میں مسلمانوں کو بہت عروج حاصل ہوا۔ تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس دور میں ترقی پر ہیں' ان کی شان وشوکت ہے' اس وقت کی دنیا کی عظیم ترین سلطنت مسلمانوں کی ہے' لیکن دین اسلام غریب ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی پہلی تہہ یعنی خلافت ختم ہوئی تو ریاست اور سیاست کا معاملہ سب سے پہلے ختم ہوا۔ اس کا اسلام سے تعلق نہیں رہا' بلکہ اب جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ ہو گیا۔ یعنی اب مشاورت سے طے نہیں ہو گا کہ کون اہل ترین آدمی ہے' کون سب سے زیادہ متقی ہے' کون سب سے زیادہ اللہ کو جاننے اور پہچاننے والا ہے' بلکہ جس کے پاس قوت ہے اسی کی حکومت ہو گی۔ اس طرح آہستہ آہستہ اسلام غریب ہونا شروع ہو گیا اور پھر حال یہ ہو گیا کہ

مسلمان بادشاہوں کے دور میں کم از کم جو قاضی ہوتے تھے اور مقدموں کا فیصلہ جو شریعت کے مطابق ہوتا تھا' وہ بھی مغربی استعمار کے آنے سے ختم ہو گیا۔ قاضی کے بجائے مجسٹریٹ آ گئے اور شریعت کے بجائے انگریز کا بنایا ہوا فوجداری اور دیوانی قانون آ گیا' البتہ انہوں نے ایک بڑی رعایت یہ کی تھی کہ ہمارے عائلی قوانین اور نماز روزے کی ہمیں اجازت دے رکھی تھی' لیکن باقی تو پورے کا پورا نظام ان کا تھا۔ تو اس طریقے سے ہوتے ہوتے اسلام غریب سے غریب تر ہو گیا۔

مندرجہ بالا حدیث کا آخری جملہ بہت غور طلب ہے۔ آپ ﷺ نے آخر میں فرمایا: ((فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) ''پس مبارک باد ہے غریبوں (اجنبیوں) کے لیے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اسلام اپنے اجنبیت کے دور میں چلا جائے گا' تب دو راستے ہوں گے۔ یا تو آپ اسلام کا دامن چھوڑ دیں اور معاشرے میں جس چیز سے عزت و مقام ملتا ہے وہی حاصل کریں اور اسی کے لیے کوشش کریں۔ اور جو راستہ اونچائی کی طرف جاتا ہے آپ بھی اسی پر چل پڑیں ع ''چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی''۔ یا دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس سب کو چھوڑ دو اور اسلام کے دامن سے چمٹے رہو۔ اسلام اگر غریب ہو گیا ہے تو تم بھی غریب ہو جاؤ۔ تمہارے جاننے پہچاننے والے' ملنے ملانے والے بھی پھر نہیں رہیں گے اور تم سے کوئی رشتہ داری کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ ظاہر بات ہے کہ پھر تم اس معاشرے کے اندر اجنبی ہو گے' لیکن ایسے اجنبی لوگوں کے لیے نبی آخر الزماں ﷺ کی زبان مبارک سے مبارک باد کے کلمات کہے گئے ہیں: ((فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) ''پس مبارک باد ہے ایسے غرباء کے لیے'' —— اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی اکرم ﷺ کی اس تہنیت اور مبارک باد کا مستحق بنائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون)

قرآن میں لفظ ’’رجال‘‘ کا مفہوم

سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۳ کی روشنی میں

حافظ محمد مشتاق ربانی

سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۳ میں ایسے لوگوں کو رجال کہا گیا ہے جو اہلِ ایمان ہیں‘ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں‘ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہیں۔ صدق و وفا ان کا خاص شیوہ ہوتا ہے اور اپنی زندگی میں اللہ سے وفاداری میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ انتظار میں رہتے ہیں کہ اپنے وعدہ کی تکمیل کے لیے اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کریں اور ہر حال میں نبی مکرم ﷺ کی اطاعت کریں۔ حقیقت میں ’’رجال‘‘ کہلانے کے لائق تو یہی لوگ ہیں۔ ان کے علاوہ تو صرف برائے نام ہیں‘ کیونکہ وہ باکمال صفات سے عاری ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾﴾

’’مؤمنوں میں سے کتنے ایسے مَرد ہیں کہ جو اقرار انہوں نے اللہ سے کیا تھا‘ اس کو سچ کر دکھایا۔ تو ان میں بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے (اپنے قول کو) ذرا بھی نہیں بدلا۔‘‘

’’رجال‘‘ یہاں اس معنی میں ہے جیسے کوئی بہت بہادری والا کام سرانجام دے تو ہم کہتے ہیں اس نے مَردوں والا کام کیا ہے‘ اس نے جواں مردی کا مظاہرہ کیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم تدبر قرآن (جلد پنجم) میں لکھتے ہیں:

’’لفظ رجال جب اس طرح استعمال ہوتا ہے (جیسے زیر نظر آیت میں ہے) تو وہ تفخیمِ شان پر دلیل ہوتا ہے‘ اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ مردانِ حق یا مردانِ کار کیا جائے تو یہ ترجمہ لفظ کی روح کے مطابق ہوگا۔‘‘

سورۃ الاعراف کی آیات جن میں اصحابِ اعراف کا تذکرہ ہے‘ وہاں رجالٌ/رجالاً وارد ہوا ہے۔ ان کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے جو لکھا ہے اس کا مفہوم درج ذیل ہے:

’’رجال کا لفظ یوں تو اپنے عام مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے بالعموم نمایاں اور ممتاز اشخاص مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (النور:۳۷) ’’ایسے رجال جن کو تجارت اور خرید و فروخت یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتی۔‘‘

مولانا صاحب نے سورۃ الاعراف کی آیت ۴۸ میں وارد لفظ رجالاً کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ائمہ کفر کے لیے استعمال ہوا ہے اور ائمہ کفر بھی نمایاں لوگ ہوتے ہیں۔

رِجال کا واحد ’’رَجُل‘‘ ہے۔ سورۃ الاحزاب کے آغاز میں لفظ ’’رجل‘‘ اس طرح استعمال ہوا ہے کہ اس میں ذکر (مرد) اور اُنثٰی (عورت) دونوں شامل ہیں۔ ارشاد ہے: ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ﴾ (الاحزاب:٤) ’’اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں رکھے‘‘۔ پروفیسر خورشید عالم نے اپنی کتاب ’’لغاتِ قرآن اور عورت کی شخصیت‘‘ میں (بحوالہ Lane's Lexicon) لکھا ہے کہ ’’رَجُلَان سے مراد کبھی کبھی مرد اور اس کی بیوی ہوتی ہے‘‘۔ مذکورہ ڈکشنری میں اصل عبارت یوں ہے: رَجُلَانِ

[some times]means A man and his wife

ویسے عمومی طور پر یہ لفظ اپنی اصل کے اعتبار سے مرد کے لیے ہی وضع ہے اور انثی یا مرأۃ/امرأۃ کے مقابل آتا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ﴾ (النساء:١) ’’اور ان دونوں (آدم و حوا) سے کثیر مرد و عورت پھیلا دیے۔‘‘

بعض مرتبہ رجل یا رجال‘ رجولت یعنی مَردوں والے کام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے‘ جیسے سورۃ الاحزاب میں ہوا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا: ﴿اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾﴾ (ھود) ’’کیا تم میں کوئی بھی شائستہ آدمی نہیں؟‘‘ سورۃ یٰسین میں اس رجل کا ذکر ہوا ہے جس نے ان دو انبیاء کی کھل کر حمایت کی جن کو ان کی قوم نے جھٹلا دیا۔ اس نازک موقع پر ایک ’’رجل‘‘ کھڑا ہوا اور اس نے انبیاء کی تکذیب کرنے والی قوم کو سمجھایا۔ اس شخص کے لیے الفاظ بیان ہوئے: ﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى﴾ (یٰسٓ:۲۰) ’’اور شہر کے دُور کے کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا‘‘۔ گویا اس نے حقیقی جوانمردی کا مظاہرہ

کیا۔حضرت موسیٰ ؑ کی جس شخص نے حمایت کی تھی اس کا بھی اللہ تعالیٰ نے ’’رجل‘‘ کہہ کر ذکر کیا: ﴿وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی﴾ (القصص:۲۰)۔

دوسرے مقام پر آل فرعون میں سے ایک صاحب ایمان شخص کو ’’رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ‘‘ (المؤمن:۲۸) فرمایا گیا جو پہلے اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔اسی طرح حضرت موسیٰ ؑ نے جب اپنی قوم کو ارضِ مقدسہ میں داخل ہونے کے لیے کہا تو ان کی قوم نے خوف محسوس کیا۔اندریں حالات رَجُلان (دو آدمی) کھڑے ہوئے اور انہوں نے ارضِ مقدسہ میں حضرت موسیٰ ؑ کی تائید کرتے ہوئے اپنی قوم کو اس میں داخل ہونے کے لیے اکسایا اور ان میں حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کردار ادا کیا۔ان دو آدمیوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کیا: ﴿قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا﴾ (المائدۃ:۲۳) ’’دو آدمیوں نے کہا جو اللہ سے ڈرتے تھے‘ اللہ کی ان دونوں پر عنایت تھی۔‘‘

ان قرآنی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع پر جو رجل/رجال استعمال ہوا ہے وہ ان اشخاص کی جوانمردی کو نمایاں کرنے کے لیے ہے‘ ان کے عظیم کارناموں کی بنا پر انہیں ایسا کہا گیا ہے۔مشہور لغت ’’لسان العرب‘‘ میں ابن سیدہ کے حوالے سے نقل ہے کہ رجل بطور صفت بھی استعمال ہوتا ہے جو کمال کا عنصر پیدا کرتا ہے۔

سورۃ الاحزاب کی زیر بحث آیت اگرچہ مردوں کے حوالے سے ہے‘ جیسا کہ لفظ رجال سے واضح ہے‘ لیکن اگر ایک عورت وہی کردار ادا کرے جو آیت میں بیان ہوا ہے تو وہ بھی اس آیت کے مصداق ہوسکتی ہے۔حضرت سُمیّہ بنتِ خیاط ؓ کا کردار دیکھیں۔یہ خاتون یاسر بن عامر ؓ کی زوجہ تھیں۔حضرت عمار ؓ ان کے بیٹے تھے۔اس عظیم خاتون کو اسلام نہ چھوڑنے کی بنا پر ابوجہل نے نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔آپ دیکھیں وہ ایک عورت ہو کر انتہا درجے کی اذیت جھیل کر صبر کا بے مثال مظاہرہ کرتے ہوئے راہِ حق میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیتی ہیں۔یہ اسلام کی پہلی شہید ہیں‘ نہ صرف عورتوں میں بلکہ مَردوں میں بھی۔اس طرح اور بے شمار مسلمان خواتین ہیں جنہوں نے بہادری کے جوہر دکھائے۔علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں جنگِ طرابلس کے حوالے سے فاطمہ بنتِ عبداللہ کا کردار نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

فاطمہ تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے!

یہ وہ چودہ سالہ عرب لڑکی ہے جو ۱۹۱۲ء کی جنگ طرابلس میں اپنے مشکیزے سے غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوگئی۔گویا ایسی خواتین جو اس نوع کے کردار کی حامل ہوں وہ بھی اس اعزاز کی مستحق ہیں جو سورۃ الاحزاب میں بیان ہوا ہے۔

صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں سورۃ الاحزاب کی زیر بحث آیت کے شانِ نزول کے بارے میں آیا ہے کہ یہ حضرت انس بن نضر ؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تو اس پر اپنے آپ کو بڑی ملامت کرتے تھے۔غزوۂ اُحد کا موقع آیا تو انہوں نے شرکت کو غنیمت جانا‘ شریک ہوئے اور شہید ہو گئے۔وہ اتنی جوانمردی سے لڑے کہ ان کے جسم پر اَسّی (۸۰) سے زائد زخموں کے نشان تھے۔عربی میں ایسی جوانمردی کے جوہر دکھانے والوں کو رجال کہا جاتا ہے۔

بعض تفاسیر میں حضرت مصعب بن عمیر ؓ کو اس آیت کا مصداق بتایا گیا ہے۔ حضرت مصعبؓ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے۔قبول اسلام سے قبل ان کی زندگی نہایت شاہانہ تھی۔اسلام لانے کے بعد ان کے والدین نے سارا سامانِ تعیّش واپس لے لیا‘ لیکن حضرت مصعبؓ بن عمیر نے حق کے راستے سے سرِمُو انحراف نہ کیا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے وفاداری کرتے ہوئے راہِ حق میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔گویا انہوں نے بھی حقیقی مردِ حق (رجال) ہونے کی اپنے عمل سے شہادت دی۔

انہی رجال میں سے ایک حضرت طلحہ بن عبید اللہ ؓ ہیں۔حضرت طلحہؓ نبی کریم ﷺ کی حیات میں شہید نہیں ہوئے بلکہ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔انہوں نے نبی مکرم ﷺ کی حیات میں غزوۂ اُحد‘ غزوۂ ذی العشیرہ اور غزوۂ خیبر میں انفاقِ مال کیا اور جود وسخا کے لیے مشہور ہوئے۔آپؓ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور یہ بلند مقام انہوں نے اعلیٰ کردار کی بنا پر حاصل کیا۔ غزوۂ اُحد میں حضرت طلحہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت اپنی جان کی بازی کھیل کر کی۔ آپ ﷺ سے تیروں کی بوچھاڑ روکی‘ تلوار اور نیزہ کے سامنے اپنا سینہ سپر کے طور پر پیش کیا۔نبی اکرم ﷺ کی حفاظت کرتے ہوئے دشمن کے وار سے آپؓ کی انگلیاں کٹ گئیں۔اسی احد کے دن حضرت طلحہؓ کے سر پر دو شدید ضربیں لگیں۔آپؓ غزوۂ حنین میں بھی ثابت قدم رہنے والوں میں سے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ رجل کہلانے کے مستحق وہی لوگ ہیں جو حضرت طلحہؓ جیسے کردار کے مالک ہیں۔

اسی طرح وہ مؤمنین صادقین جو غزوۂ اُحزاب میں شریک ہوئے اور مشکل حالات سے

نہ گھبرائے۔ جنہوں نے غزوۂ بنی قریظہ میں اپنا کردار ادا کیا' وہ بھی اس کے مصداق ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں غزوات میں عملاً لڑائی کا موقع نہ آیا۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہ رجال وہ اہل ایمان ہیں جنہوں نے بیعتِ عَقبہ ثانیہ کی۔ وہ ۷۳ مرد اور ۲ عورتیں تھیں' جو مدینہ طیبہ سے آئے اور حج کے ایام میں انہوں نے سمع وطاعت' تنگی اور خوشحالی ہر حالت میں دین کے لیے مال خرچ کرنے' امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے' حق کی حمایت میں کھڑے ہونے' نبی مکرم ﷺ کی مدد اور ان کے دفاع جیسے امور کے بارے میں بیعت کی۔ ان تمام امور کی انہوں نے کماحقہ پاسداری کی۔ وہ کسی مرحلہ میں بھی نہیں لڑکھڑائے۔ ہر حال میں انہوں نے اپنی بیعت کو پورا کرنے کا خیال رکھا۔

ہم بھی کلمۂ شہادت ادا کرنے سے مسلمان ہیں۔ یہ کلمہ ایک عہد و پیمان ہے۔ ہم پر اس کی پاسداری اور ہر لحہ اس کی حفاظت لازم ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران) ''اور تمہیں موت ہرگز نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم اسلام کے مطابق زندگی گزار رہے ہو''۔ اوپر مذکور شخصیات اپنے عہد کو پورا کرنے کی وجہ سے ممتاز ہوئیں' جیسا کہ الفاظ وارد ہوئے: ﴿صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾۔ ہمارے پاس بھی موقع ہے کہ ہم نے کلمہ کی صورت میں جو اقرار کیا ہے اس وعدہ کو پورا کریں۔ ہم ایک مسلمان کی طرح زندگی گزاریں گے تبھی ہم حقیقت میں رجال کہلانے کے حقدار ہیں' ورنہ محض گوشت پوست کے ڈھانچے ہیں۔

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے　　اشاعت عام: 15 روپے

امامت وخلافت: چند مباحث

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

آئندہ صفحات میں پیش کردہ اقتباسات حضرت علامہ محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عمدہ تالیف ''عقائد الاسلام'' سے اخذ کردہ ہیں۔ مولانا موصوف اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' اور سیرت پر تالیف ''سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم'' کی بنا پر علمی حلقوں کی ایک محبوب شخصیت ہیں۔ آپ بیک وقت علومِ لغت، علمِ کلام، تفسیر، حدیث اور فقہ میں مہارت اور رسوخ کے حامل تھے۔ اسی بنا پر علماء کی صف میں نمایاں مقام حاصل رہا۔ اپنی کتاب ''عقائد الاسلام'' شائع کردہ مکتبہ عثمانیہ، جامعہ اشرفیہ لاہور، میں آپ نے عقیدۂ اسلام بیان فرماتے ہوئے چند اُن موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جو قدیم فقہی لٹریچر میں ''السیاسۃ الشرعیۃ'' کے موضوعات شمار کیے جاتے ہیں، مگر چونکہ زمانۂ سلف ہی سے عقیدے کی کتب میں اہل تشیع اور دیگر فرق سے امتیاز کے لیے ان موضوعات پر بھی ضمناً تبصرہ کیا جاتا رہا ہے لہٰذا موجودہ زمانے کی رعایت کے ساتھ مولانا کاندھلویؒ نے بھی بیانِ عقائد میں ان موضوعات پر مختصراً کلام فرمایا ہے۔ قارئین کی دلچسپی، بعض افراد کی لاعلمی کے ازالے اور وابستگانِ تحریکاتِ اسلامیہ کے فوری حوالے (Ready Refrence) کے لیے مذکورہ کتاب سے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔ ان اقتباسات میں مولانا موصوف نے فقہی اور دعوتی اسلوب کا امتزاج پیدا کرتے ہوئے مدعا کی زوردار ترجمانی کی ہے۔ البتہ اردو قدیم طرز کی ہے۔

ارسال کردہ: مرکز تعلیم وتحقیق، قرآن اکیڈمی یٰسین آباد کراچی

امامت وخلافت

خلافت اور امارت کی بحث اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک اگرچہ اصولِ دین سے نہیں، لیکن چونکہ روافض واہل بدعت نے اس میں بہت افراط وتفریط کی ہے اس لیے علماء حق نے اس بحث کو علم کلام میں داخل کر دیا تاکہ حقیقت حال واضح ہو جائے اور اہلِ سنت اور اہلِ بدعت میں امتیاز ہو جائے۔

مسلمانوں پر واجب ہے کہ جس شخص کو دینی اور دنیوی اور سیاسی اور انتظامی امور میں ممتاز دیکھیں اس کو باہمی اتفاق سے اپنا امام اور امیر مقرر کر لیں تاکہ وہ مسلمانوں کے دینی اور دنیوی امور کا انتظام کرے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے باہمی نزاعات کا شریعت کے مطابق فیصلہ اور قصاص کا جاری کرنا اور اسلامی سلطنت کی حدود کی حفاظت کرنا اور کافروں سے جہاد کے لیے لشکر تیار کرنا اور چوروں اور بدمعاشوں کا انتقام کرنا اور ضعیف اور کمزور معذور اور مجبور مسلمانوں کے معاش اور پرورش کا انتظام کرنا، مظلوم کا ظالم سے انصاف کرنا، کمزور کا زورآور سے حق دلانا وغیرہ وغیرہ یہ تمام امور عقلاً شرعاً واجب ہیں اور یہ کام بدون (یعنی بغیر) کسی امیر اور بادشاہ کے انجام نہیں پا سکتے۔ معلوم ہوا کہ امیر کا مقرر کرنا فرض اور واجب ہے تاکہ مسلمان اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے ہلاکت اور تباہی سے محفوظ ہو جائیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا امیر مقرر کیا تاکہ مسلمانوں کے دینی اور دنیوی امور خیر وخوبی کے ساتھ انجام پا سکیں۔ اگر خلیفہ اور امیر کا مقرر کرنا شرعاً فرض اور لازم نہ ہوتا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم انتخابِ امیر کے مسئلہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین پر مقدم نہ کرتے۔ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ایک مستقل حجت ہے جس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

اسلامی حکومت کی تعریف

اسلامی حکومت وہ حکومت ہے کہ جس حکومت کا نظامِ مملکت، شریعت اسلامیہ کے ماتحت اور اُس کے مطابق ہو اور حکومت کا مذہب من حیث الحکومت، اسلام ہو اور اُس حکومت کا دستور اور آئین قانون شریعت ہو اور حکومت من حیث الحکومت دل وجان سے دین اسلام کے اتباع کو فرض اور لازم سمجھتی ہو اور زبان سے بھی اس کا اقرار کرتی ہو۔ اور خلیفۂ اسلام اور بادشاہ اسلام وہ شخص ہے کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہونے کی حیثیت سے شریعت اسلامیہ کے مطابق ملک

میں ملکی اور ملی نظام جاری اور نافذ کرے۔

خلافتِ راشدہ کی تعریف

پس اگر حکومت کا ملکی اور ملی نظام منہاجِ نبوت پر ہو تو ایسی حکومت کو خلافتِ راشدہ کہتے ہیں۔ اس لیے جو حکومت سراسر منہاجِ نبوت پر ہوگی تو وہ یقیناً راشدہ (یعنی سراپا رشد و ہدایت) ہوگی اور خلیفہ راشد وہ ہے جو علم اور عملِ صالح اور ورع اور تقویٰ میں نبی ﷺ کا نمونہ ہو۔ ظاہر میں بادشاہ فرمانروا ہو اور باطن میں وہ اعلیٰ درجہ کا ولی ہو اور اُس کی ولایت نبی ﷺ کی نبوت کا عکس اور پرتو ہو۔ پس جس تن اور بدن میں بادشاہت اور ولایت دونوں جمع ہو جائیں تو وہ تن اور بدن خلیفہ راشد ہے۔ اور اگر حکومت و سلطنت کا نظم و نسق نبوت پر نہ ہو تو اگر اس میں عدل و انصاف اور امانت اور دیانت غالب ہو تو وہ حکومت حکومتِ عادلہ کہلائے گی' ورنہ حکومت ظالمانہ اور جابرہ اور جائرہ کہلائے گی۔

اسلامی حکومت کی تعریف میں جو یہ قید لگائی گئی کہ حکومت کا مذہب من حیث الحکومت اسلام ہو سو یہ قید اس لیے لگائی گئی کہ اسلامی حکومت ہونے کے لیے حاکم کا ذاتی طور پر مسلمان ہونا کافی نہیں جب تک خود حکومت کا مذہب من حیث الحکومت اسلام نہ ہو اور حکومت کے دستور کی اولین دفعہ یہ ہو کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے۔ اس لیے کہ جو حکومت من حیث الحکومت اپنے اساسی دستور میں علی الاعلان اس بات کا اقرار اور اعتراف نہ کرے کہ اس حکومت کا مذہب دینِ اسلام ہے تو وہ اسلامی حکومت نہیں کہلا سکتی۔ جیسے آج کل قومی اور عوامی اور نیشنل حکومت کا چرچا ہے' سو ایسی حکومت اسلامی حکومت نہیں کہلا سکتی جو حکومت اللہ کی حاکمیت اور قانونِ شریعت کی برتری اور بالادستی کو نہ مانتی ہو' بلکہ یہ کہتی ہو کہ حکومت عوام اور مزدوروں کی ہے اور ملک کا قانون وہ ہے جو عوام اور مزدور مل کر بنائیں سو ایسی حکومت بلاشبہ حکومتِ کافرہ ہے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ (الانعام:۵۷) ترجمہ: ''فیصلے کا اختیار تو صرف اللہ کو ہے۔'' ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ (المائدۃ:۴۴) ترجمہ: ''اور جو لوگ بھی اللہ کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے' پس یہی لوگ تو کافر ہیں۔'' ﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ۝﴾ (المائدۃ:۵۰) ترجمہ: ''کیا یہ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں!'' جو فرد یا جماعت قانونِ شریعت کے اتباع کو لازم نہ سمجھے اس کے کفر میں کیا شبہ ہے؟......

ایمان نام ماننے کا ہے اور کفر نام نہ ماننے کا ہے!

بادشاہِ اسلام

بادشاہ اسلام وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو ملک کا مالک حقیقی اور حاکم اصلی جانے اور مانے اور خدا کا بندہ اور رسولِ خدا ﷺ کے نائب اور قائم مقام ہونے کی حیثیت سے قانونِ شریعت کے مطابق ملک کا انتظام کرے۔ لہٰذا اسلامی حکومت کے فرمانروا کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ مسلمان ہو اور نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان رکھتا ہو' اور ظاہر ہے کہ نبی کا کافر اور منکر' نبی کا نائب اور قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

جس طرح اشتراکی اور مغربی حکومت میں صدارت اور وزارت کے منصب پر وہ شخص فائز نہیں ہو سکتا کہ جو اشتراکی یا مغربی نظریہ کا قائل نہ ہو اور حکومت کے بنیادی نظریہ کو اور حکومت کے دستور اور قانون کو نہ مانتا ہو یا حکومت کا باغی ہو تو ایسا شخص کسی قومی اور جمہوری حکومت میں کسی عہدہ کا مستحق نہیں......اور خلیفۂ اسلام کی تعریف میں نائب نبی ہونے کی حیثیت سے انتظام کرنے کی قید اس لیے لگائی گئی تاکہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور خلفاء اسلام رضی اللہ عنہم میں فرق ظاہر ہو جائے۔ اس لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام خداوند ذوالجلال کے خلیفہ اور نائب کہلاتے ہیں' جیسے حضرت آدم علیہ السلام بھی اللہ کے خلیفہ تھے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ﴾ (البقرۃ:۳۰) ترجمہ: ''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔'' حضرت داؤد علیہ السلام بھی اللہ کے خلیفہ تھے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى......﴾ (ص:۲۶) ترجمہ: ''اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنا دیا' تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو......''

خلیفۂ اسلام اور شاہانِ اسلام آنحضرت ﷺ کے خلیفہ ہوتے' حضورِ پُر نور ﷺ کے نائب اور قائم مقام ہونے کی حیثیت سے آپؐ کی شریعت کے مطابق حکم چلاتے ہیں......اور اگر حکومت زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتی ہے مگر درپردہ دیدہ و دانستہ بے دین لوگوں کے مشورہ سے ملک میں ایسے قوانین اور احکام جاری کرتی ہے کہ جو صریح کتاب و سنت اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہیں تو ایسی حکومت حکومتِ نفاق ہے اور ایسی حکومت کے اربابِ اقتدار فی الحقیقت جنس کفار سے ہیں' احکامِ آخرت کے اعتبار سے اِن میں اور کفار میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن چونکہ اپنی زبان سے دعویٰ اسلام کا کرتے ہیں پس ان کا کفر پوشیدہ ہے۔ ان کا ظاہری اسلام

اس امر کا متقاضی ہے کہ ان کے ساتھ معاملہ مسلمانوں کا سا کریں گو وہ آخرت میں کُفار اَشرار کے ساتھ درکاتِ نار میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ مگر ہمیں نہ کسی کے دل کا حال معلوم ہے اور نہ آخرت کا حال معلوم ہے' اس لیے ایسی صورت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ اُن کے دل کا اور اُن کی آخرت کا معاملہ تو خداوندِ علّام الغیوب کے سپرد کر دیں اور ظاہری معاملات میں اُن کے زبانی دعوائے اسلام کی وجہ سے مسلمانوں جیسا معاملہ کریں۔

ایسی ریاست دین اسلام کے لیے سمِ قاتل ہے...... ایسی سلطنتِ ضالّہ کی مخالفت اور منازعت بقدرِ استطاعت شرعاً عقلاً فرض اور لازم ہے' بشرطیکہ اس ریاست اور اقتدار کے ختم ہو جانے کے بعد سلطنت عادلہ اور ریاست صالحہ کے قائم ہو جانے کا یقین یا ظن غالب ہو کہ اس حکومت کے خاتمہ کے بعد دوسری آنے والی حکومت یقیناً یا بظن غالب اسلام اور اہل اسلام اور ملک وملت اور رعایا کے لیے نفع بخش اور راحت رساں ہوگی۔ شرعاً عقلاً ایسے بے دینوں اور گمراہوں کو ذلیل اور رسوا کرنا آئندہ آنے والوں کے لیے باعث عبرت ہوگا۔ یہ وقت نہایت نازک ہے جس میں غایت درجہ احتیاط واجب ولازم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ظالم سے نجات ملے اور اُس سے بڑھ کر دوسرے ظالم کے پنجہ میں جا پھنسیں۔

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

اصطلاح کی بحث

جمہوریت یا نظامِ خلافت؟

محمد احمد بلال
b.subhani@yahoo.co.uk

اس مضمون میں اس بات کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان میں حقیقی تبدیلی کے slogan کے طور پر ''جمہوریت'' (اسلامی) کی بجائے ''نظام خلافت'' کی اصطلاح زیادہ صحیح اور مؤثر ہے۔ پیشِ نظر ایسا کوئی دعویٰ کرنا نہیں کہ اس سلسلے میں آخری رائے آ جائے' بلکہ اہلِ علم ودانش تک اپنی گزارشات پہنچانا ہے' کہ وہ اس پر سوچ بچار کریں۔ بعض جگہوں پر تفصیل کا مقصد اس مضمون کو عام افراد کے لیے مفید بنانا ہے۔ ناگزیر وجوہات کی بنا پر انگریزی الفاظ کا استعمال کثرت سے کرنا پڑا ہے۔ مشکل کی صورت میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

بظاہر ''جمہوریت'' ایک لفظ ہے' لیکن اس میں تفصیلات پنہاں ہیں۔ اصل کے اعتبار سے Liberal Democracy کا اپنا حکومتی نظام ہی نہیں بلکہ نظامِ اَقدار ہے۔ یہ ایک عقیدہ بھی ہے اور اس میں اپنے Ideals بھی ہیں۔ غرضیکہ جمہوریت آج ایک مکمل نظریہ حیات ہے' اور بلاشبہ یہ ایک Secular Concept ہے۔ البتہ اس میں ایک استثناء (exception) ہے' جسے ہم ''اسلامی جمہوریت'' کہتے ہیں۔ اسلامی جمہوریت کے حوالے سے اہل علم کافی محنت سے بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہ مانتے ہوئے کہ تفصیلات کے اعتبار سے ''اسلامی جمہوریت'' اور ''نظامِ خلافت'' ایک ہی نظام کے دو مختلف نام ہیں' مجھے صرف ان اصطلاحات کے حوالے سے بات کرنا ہے۔

ہمارا درخشاں ماضی یعنی خلافت راشدہ جس کو بعض حضرات ''چودہ سو سال پرانا دور'' یہ تاثر (impression) دیتے ہوئے بولتے ہیں جیسے یہ دنیا کی تخلیق سے بھی پہلے کا واقعہ ہو' حالانکہ انسانی تاریخ جاننے والے حضرات کو معلوم ہے کہ یہ عرصہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ ویسے

بھی علم میں پختگی لانے کے لیے انسانی تاریخ سے اُصول لیے جاتے ہیں۔ لیکن بہرحال جدید دور کے اپنے تمدّنی تقاضے ہیں' جس کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک کے حکومتی نظام کے templates لینے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ نبی اکرم ﷺ کے عطا کردہ نظام کی برکات کو دنیا پر واضح کرنے کے لیے بھی یہ ضروری ہوگا کہ اسلامی اُصولوں پر جو نظام قائم کیا جائے وہ fundamentals کے اعتبار سے تو لازمی طور پر' البتہ عرف عام کے اعتبار سے بھی original source سے وابستہ ہو۔ کیونکہ جس اصطلاح میں ہم بات کرتے ہیں' اہل علم وفکر کی توجہ لازماً اس کی تاریخ کی طرف جاتی ہے۔ اور پھر اس پر مزید غور وفکر کے راستے کھلتے ہیں۔ جیسا کہ آج مغربی جمہوری ملک اپنے نظام کی تاریخ قدیم یونانی شہری ریاست Athens تک لے جاتے ہیں' جس سے اس نظام کو ایک اخلاقی support ملتی ہے۔

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ اپنی کتاب ''خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام'' میں لکھتے ہیں:

> ''...... جب جماعت اسلامی میں مولانا امین احسن اصلاحی کی شمولیت کے بعد ان کے قرآنی فکر کا دھارا بھی مولانا مودودی کے افکار کے دھارے میں شامل ہوگیا تو اُس وقت اس کی تعبیر کے لیے خالص قرآنی اصطلاحات یعنی ''شہادت علی الناس''...... ''فریضۂ اقامت دین'' اور ''غلبۂ دینِ حق'' کا استعمال عام ہوگیا۔
>
> چنانچہ جب خود میں نے ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد ۱۹۶۵ء میں اپنی ذاتی مساعی کا آغاز کیا تو انہی اصطلاحات کو نہ صرف اپنایا بلکہ اپنی بساط بھر مزید مدلل اور مبرہن بھی کیا۔ مزید برآں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے فرضِ عین ہونے پر قرآن وسنت سے بھرپور استدلال قائم کیا اور اس کے مراحل ولوازم کے پورے نقشے کو بھی سیرت النبی ﷺ سے اخذ کر کے دکھایا...... تاہم یہ احساس ضرور رہا کہ ان ثقیل اصطلاحات سے پڑھا لکھا طبقہ تو قدرے قلیل محنت سے مانوس ہو بھی سکتا ہے' لیکن عوام الناس کے ذہن وقلب تک ان کے ذریعے رسائی ممکن نہیں ہے۔ میں اسی حیص بیص میں تھا کہ متذکرہ بالا حلقوں کے ذریعے ''خلافت'' کی اصطلاح کی جانب ذہن منتقل ہوا۔ اور اس کے ساتھ اس حقیقت کی جانب بھی توجہ ہوئی کہ ''خلافتِ راشدہ'' کی تابناک یاد پوری نوعِ انسانی کے اجتماعی تحت الشعور میں ایک حسین خواب کی مانند ثبت ہے' لہٰذا اس کے ذریعے عوام وخواص دونوں کے قلوب واذہان تک بآسانی رسائی

حاصل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے لیے ''تحریکِ خلافت پاکستان'' کے عنوان سے ایک ادارہ باقاعدہ رجسٹر کرا کے اس کے تحت کام شروع کر دیا!'' (ص ۷)

''خلافت'' کی اصطلاح کو جدید مسلم مفکرین اور دورِ حاضر کے علماء نے بھی واضح کیا ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر علامہ اقبال کی شاعری میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر!

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی تحریروں میں اس پر لکھا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب ''اسلامی ریاست'' میں اس پر بحث کی ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ نے ''خلافت و جمہوریت'' کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کی قیادت میں ''تحریک خلافت'' کی تو کوئی دوسری مثال ہی نہیں ملتی۔ امام تقی الدین النبھانیؒ نے اپنی تحریروں میں اسے موضوع بنایا ہے۔ سید قطبؒ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ اصطلاح آج کسی کے ذہن میں اچانک نہیں آ گئی ہے' بلکہ گزشتہ صدی میں بھی اس کو احترام حاصل رہا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ پاکستان کا Politico-Socio-Economic System اسلامی نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام میں نہ تو سودی لین دین کی گنجائش ہے اور نہ ہی جاگیرداری کی۔ جوئے' لاٹری اور منشیات کا خاتمہ بھی ضروری ہے اور جنسی نمائش سے کاروبار چمکانے کا بھی۔ اس سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام کو بنیاد سے تبدیل کرنے اور اِسے اسلام کے قالب میں ڈھالنے کے لیے ایک انقلاب ناگزیر ہے۔ البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ انقلابی جماعت کے کارکن غیر مسلّح جدوجہد کریں۔ فلسفہ انقلاب کی رو سے انقلابی نظریہ پہلے سے موجود نظام کی جڑوں پر تیشہ بن کے گرنا چاہیے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے پاکستان نژاد پروفیسر ڈاکٹر حسن عسکری بیان کرتے ہیں:

"Ideology: It offers a review of the existing political, social and economic arrangements. It is infact a critique of existing political, social and economic order."

اگرچہ ''اسلامی جمہوریت'' بھی اسی نظام کو اختیار کرنے کا نام ہے جن کا اسلام تقاضا کرتا ہے۔ لیکن اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ انقلابی نظریہ کو بڑے پیمانے پر ابلاغ کے لیے جمہوریت کی بجائے ایک دوسری اصطلاح کی ضرورت ہے' کیونکہ کسی بھی نظریہ کو مکمل طور پر نافذ العمل بنانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کو وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے اجتماعی شعور میں گہرا اُتار دیا

جائے تا کہ یہ قوم کی Psyche کا لازمی حصہ بن جائے۔ ایسا کیے بغیر کوئی بھی نظریہ معاشرے میں اپنے ثمرات پورے طور پر نہیں دکھا سکتا۔ لیکن پہلے یہ بات سمجھنی ضروری ہے کہ نئے نظام کی طلب پیدا کرنے کے لیے اس کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ نظام کا اِبطال (refutation) ضروری ہے (کلمہ طیبہ میں بھی پہلے تمام دیگر الٰہوں سے بے زاری اور پھر ایک اللہ کو ماننے کا اقرار ہے)۔ یہ کام محنت طلب تو ہوتا ہی ہے البتہ یہاں حکمت بھی مطلوب ہے۔ آپ کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں دونوں نظاموں کا تقابلی موازنہ کرنا ہوتا ہے تا کہ بات black & white کی طرح واضح ہو جائے۔ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت ہو جائے اور مخاطب بھی دو متضاد حقیقتوں کو سمجھنے کے بعد دوسروں کو سمجھا بھی سکے۔

اب سوچیے کہ ہم پاکستان میں اسلامی نظام لانا چاہتے ہیں' جبکہ ہمارے یہاں دانشوروں میں جمہوریت کے لبرل اور اسلامی دونوں ہی ایڈیشنز کی حمایت پائی جاتی ہے۔ یعنی ایسے ''تعلیم یافتہ'' حضرات بھی ہیں جو برملا یہ کہتے ہیں کہ وہ سیکولر جمہوریت کے قائل ہیں۔ لیکن زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ اکثر liberal جمہوریت کے ماننے والے بھی اسلامی جمہوریت کی اصطلاح کو ڈھال بنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ گجرات یونیورسٹی میں اقبال اکیڈمی کی جانب سے منعقدہ سیمینار بعنوان ''Iqbal and Present Day Problems'' میں مولانا عمار خان ناصر صاحب ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ پاکستان کا موجودہ نظام اقبال کے vision کے مطابق ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ بعض حضرات تو ایسے چھپے رُستم ہیں کہ اگر ان کا پس منظر (background) معلوم نہ ہو تو یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ جس بلا کو یہ ''جمہوریت'' کہہ کر پکار رہے ہیں اس کے سوتے کہاں سے پھوٹتے ہیں (ع ''چہرہ روشن' اندروں چنگیز سے تاریک تر!'')۔ اس تناظر میں یہ بات تو طے ہے کہ عوام الناس میں ''جمہوریت'' کا کوئی ایک مفہوم طے شدہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں پر دونوں ایڈیشنز باہم خلط ملط (intermingle) ہیں۔ اس صورتِ حال میں آپ موجودہ استحصالی نظام کو کس نام سے refute کریں گے' اگر آپ کا پیش کردہ پروگرام بھی اسی اصطلاح سے متعارف کروایا جائے تو؟ جبکہ ریسرچ میں یہ اُصول مانا جاتا ہے کہ:

"Confusions about the meaning of a concept can destroy the value of its study."

لہٰذا میرا یہ احساس ہے کہ اکثر حضرات کا دینی جذبہ انہیں اسلامی انقلاب کی جدّوجہد پر اس لیے

آمادہ نہیں کرتا کیونکہ انہیں مغربی اور اسلامی جمہوریت میں فرق سمجھ نہیں آتا۔ اُن بے چاروں کا کیا قصور کہ جب اُن کے سامنے شیخ الاسلام بھی کھڑے ہو کر کہہ رہے ہوں:

"I am a strong believer of Democracy."

اور ایک امریکی سفیر بھی یہ کہہ رہا ہو: ''ہم پاکستان میں جمہوریت کو مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں!''

ابلاغِ عام کے عمل میں بھی ایک ہی گفتگو مختلف ذہنی سطح کے مطابق کرنا مشکل کام ہے۔ ہمارے یہاں تو' جیسے میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ جمہوریت کی استثنائی (exceptional) صورت ہے۔ کسی بھی concept کا ایک تعارف/ مفہوم وہ ہوتا ہے جو عام لوگ سمجھتے اور بولتے ہیں اور ایک اس کی exception ہے۔ تو یہ سمجھنا کتنا مشکل ہے کہ مستعار لی گئی اصطلاح کے معنی تبدیل کر کے اُس کا نیا مفہوم عوام الناس پر واضح کیا جا سکے؟ جبکہ اس کا اصل مفہوم بھی سوسائٹی میں لکھا' پڑھا اور بولا جا رہا ہو۔ فکری دنیا میں بہت بڑا مسئلہ فضا میں اتنی confusion ہے کہ کوئی سادہ لوح آدمی یہ طے نہیں کر پاتا کہ حقیقت کیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اپنی کتاب ''دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار'' میں رقمطراز ہیں:

> ''حق و باطل کی ملاوٹ دعوت و اصلاح کے کام کو بہت مشکل اور دیر طلب بنا دیتی ہے۔ اگر مقابلہ صرف باطل سے ہو تو اس کو آسانی سے سر کیا جا سکتا ہے' لیکن جہاں حق و باطل دونوں ملے جلے ہوئے ہوں اور باطل کی حمایت کے لیے حق کو سپر کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہو وہاں حق کی حمایت میں کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے سے پہلے داعیانِ حق کو ایک جہادِ عظیم اس مقصد کے لیے کرنا پڑتا ہے کہ وہ لوگوں پر یہ آشکارا کر سکیں کہ زیر بحث نظام میں اگر کچھ اجزاء حق کے ہیں تو وہ حق کی خاطر نہیں ہیں' بلکہ باطل کی خدمت کے لیے ہیں۔''

جیسا کہ ''مذہب'' کی اصطلاح گزشتہ کچھ صدیوں سے بین الاقوامی طور پر پرائیویٹ عقیدہ' رسومات اور عبادات کے لیے بولی جاتی ہے (حالانکہ اسلامی تاریخ میں یہ وسیع تر معنی میں استعمال ہوتی آئی ہے)۔ لہٰذا موجودہ محدود تصور کی اصلاح کے لیے گزشتہ صدی میں مسلمان مفکرین نے ''مذہب'' کی بجائے ''دین'' کی اصطلاح کو زیادہ مؤثر طور پر استعمال کیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اسلام دین ہے' محض مذہب نہیں۔ اسی طرح جمہوریت کی بجائے نظامِ خلافت کی اصطلاح کو اختیار کرنے سے موجودہ confusion دور ہو گی۔ ہجرتِ مدینہ

کے بعد وہاں کے یہود رسول اللہ ﷺ کا کردار مسلمانوں کی نظر میں مجروح کرنے کے لیے تخاطب کا غلط انداز اختیار کرتے تھے' جس پر قرآن میں حکم آیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا﴾ (البقرۃ: ۱۰۴)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! راعنا نہ کہا کرو بلکہ اُنظرنا کہو' اور توجہ سے بات کو سنو!''

یہاں اہل ایمان کو لفظ ''رَاعِنَا'' کہنے سے منع فرمایا گیا ہے' حالانکہ اس کے معنی بھی غلط نہیں ہیں' یعنی ''ہماری رعایت کیجیے'' لیکن ذرا سا لہجہ (dialect) تبدیل کر لینے سے اس کے معنی توہین آمیز ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ ''اُنْظُرْنَا'' کہہ لیا کرو۔ اصطلاحات کو واضح اور غیر مبہم بنانے کی طرف قرآن نے بھی بہت زور دیا ہے۔

اسلام پسند حلقوں کا ''جمہوریت'' کی اصطلاح کو ''خلافت'' پر ترجیح دینے سے باطل کی سازشیں بھی بآسانی کامیاب ہو رہی ہیں۔ مثلاً لبرل جمہوریت کا ایک لازمی تقاضا "women's empowerment" ہے۔ خواتین کو آزادانہ رائے کا حق exercise کرنے کے لیے مرد کے مقابلے میں طاقتور بنانا ہوگا۔ چنانچہ United Nations Development Programme اس ضمن میں واضح کرتا ہے:

> *"Through our global network, we work to ensure that women have a real voice in all governance institutions, from the judiciary to the civil service, as well as in the private sector and civil society, so they can participate equally with men in public dialogue and decision-making and influence the decisions that will determine the future of their families and countries."*

گلوبلائزیشن کے اس دور میں تمام قومی حکومتوں پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اس پر عمل درآمد کے راستے ہموار کریں اور اپنے ملک میں وہ تمام سہولیات مہیا کریں جو مطلوب ہوں۔ پاکستان میں بھی اس کا نفاذ ہوتے ہوتے بات اسلامی حدود سے آگے جا چکی ہے۔ لہٰذا خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا پر ''خواتین کے حقوق'' کے نام پر بداخلاقی اور بدکرداری کو جواز مہیا کیا جاتا ہے۔ اور feminist کردار talk shows میں قرآنی آیات اور احادیث سُناتے ہوئے اپنا موقف پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ ''جمہوری حقوق'' کا نعرہ تو وہ کئی بار لگاتے ہیں۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لبرل جمہوریت میں کیا کسی کو قرآن یا حدیث سے استدلال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے؟ اور اگر نہیں تو اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے کہ اسلامی جمہوریت کی آڑ میں

باطل افکار پھیلائے جاتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے ناظرین جانتے ہیں کہ ان liberal fascists کا رویہ اتنا توہین آمیز ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ! جو علماء ان کے ہتھے چڑھ جائیں وہ بالآخر دفاعی پوزیشن سنبھالتے ہوئے نظر آئیں گے۔ لہٰذا اسلامی جمہوریت کا باہر سے درآمد شدہ ایڈیشن کامیابی سے پروان چڑھ رہا ہے۔

ہمارے ایک دوست گزشتہ دنوں PEMRA کے سربراہ سے ملاقات کے لیے گئے تو ان سے کہا کہ وہ میڈیا چینلز پر سے فحاشی وعریانی ختم کروائیں' جبکہ سب چلا چلا کر یہ کہہ رہے ہیں۔ تو ان کا جواب تھا: ''پہلے فحاشی اور عریانی کو define تو کر لیں!'' مطلب یہ کہ اسلامی اقدار کو جمہوریت کے اصولوں پر redefine کرنا ہوگا' ورنہ اِن کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت مذہب پسند معاشروں کو secularize کرنے کا ایک عمل ہے جس کی یہ فروع (corollaries) ہیں۔ اس ضمن میں Michael Daniel Driessen جو کہ پولیٹیکل سائنس اور بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر ہیں' ان کے Ph D مقالے کا حوالہ دیتا چلوں:

"What are the effects of bringing religion into the public sphere in new democracies, especially those, such as Islam and Catholicism, which have been considered to be hostile to democratic precepts?
I argue that a democratizing regime may win over the support of a hostile-to- democracy religion by guaranteeing that religion a voice in the public sphere. This dissertation explains this outcome as a function of the effects of religiously friendly governmental policies on both the goals of religious authorities and the political salience of the religious identities of religiously faithful individuals. These shifts in the political goals and identities of religious actors can help make democracy possible in a nation whose religious market is dominated by a society-wide religion, which I define as any major religion which can claim 70% or more of a population.s self-reported religious identity, with ambiguous or even hostile intentions toward democratic ideas and institutions."
(Dissertation Title: "Religiously Friendly Democratization: Framing Political and Religious Identities in Catholic and Muslim Societies.")

اب ہمارے یہاں اہلِ فکر ونظر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھیں' جو عنصر بھی ان ارادوں کی تکمیل میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ممدّ ومعاون (supportive) ہو اس کی اصلاح کرتے ہوئے اُس کا کردار تبدیل کریں۔ اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ نئے دور کی جو اصطلاحات باطل تصورات کے ساتھ منتھی (bracketed) ہوں ان کی جگہ ایسی اصطلاحات استعمال کی جائیں جن کی جداگانہ پہچان ہو اور ان میں کوئی ابہام نہ پایا جاتا ہو۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہمارے یہاں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو کہ دل سے تو مخلص ہیں لیکن نادانی میں وہ ہر قسم کی جمہوریت کو کفر کہہ دیتے ہیں۔ لہٰذا جب ایک اسلامی انقلابی جماعت جمہوریت کی اصطلاح استعمال کرے تو ان حضرات کے reactionary جوابات کے لیے نہ صرف اضافی محنت چاہیے ہوگی بلکہ ممکن ہے وہ کبھی اس بات پر مطمئن نہ ہوں۔ ملا صوفی محمد صاحب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آخر کار ایک قیاس پر مبنی شے (abstract) کو حقیقت (reality) کے مقابلے میں واضح کرنا کتنا مشکل کام ہے!

(Psychology says: Concept s are mental images of reality.)

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اصطلاح ایسی ہو کہ جس سے ذہن حجاب محسوس نہ کرے' بلکہ کیفیت یہ ہو کہ:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

Neo-Orientalism میں اسلام کی مقدس ہستیوں کی شان میں جو گستاخانہ مہم چلائی گئی ہے' جس کا ذکر Center for Global Dialog University کے ڈائریکٹر ڈاکٹر منور اے انیس نے اپنے مقالے "Islamophobia, Neo-Orientalism And the Prophet (SAWS)" (شائع شدہ حکمت قرآن' اپریل۔جون 2012ء) میں کیا ہے' کے زہریلے اثرات کو ختم کرنے کا دیرپا حل بھی یہ ہے کہ جس نظام کا نمونہ خیر القرون میں اُن ہستیوں نے دنیا کو دکھایا' آج اس سے پوری دنیا کو متعارف کروایا جائے۔ اور اس ''اہم ترین فرضِ عین'' کی جدوجہد کے دوران بھی عامۃ الناس کا ان مقدس ہستیوں کے ساتھ قلبی لگاؤ مزید گہرا کرنے کے لیے ایسی اصطلاحات استعمال کی جائیں جن سے یہ باہمی تعلق بالکل واضح ہوتا ہو۔ ورنہ ان آئیڈیل ہستیوں سے تعلق کمزور ہو جاتا ہے۔

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ''خلافت'' کی اصطلاح سے جدید تعلیم یافتہ حضرات

ناگواری (offended) محسوس کرتے ہیں اور اس سے حالات میں ناسازگاری پیدا ہوتی ہے' لہٰذا یہ بات کرنا اور دنیا کے سامنے اسے اعلانیہ پیش کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لیے اس خدمتِ دین کے لیے وہ کچھ ایسی تدبیریں تجویز کرتے ہیں جو ''ممکن العمل'' ہوں اور تجربے سے دین کے احیاء میں مفید ثابت ہو چکی ہوں یا جو آگے چل کر دین کے مشن کے لیے حالات کو نسبتاً زیادہ سازگار بنا دینے والی ہوں۔ ان حضرات کے اخلاص میں شک نہیں' البتہ ملاحظہ فرمائیں مولانا صدرالدین اصلاحی اپنی کتاب ''فریضہ اقامتِ دین'' کے صفحہ ۸۲ پر کیا لکھتے ہیں:

''نہ حالات کی سازگاریوں کا اندازہ لگانے کی کوئی گنجائش ہے اور نہ کامیابی کے امکانات ٹٹولنے کا کسی کو حق ہے۔ جو چیز ہمارا فریضہ زندگی قرار پا چکی وہ ہر حیثیت سے اس بات کی مستحق ہے کہ جب تک زندگی ہے اس کے لیے پوری پوری جدوجہد کرتے رہیے۔ وہ فرض دراصل دل سے فرض مانا ہی نہیں گیا جس کو مشکلات کے اندیشے سردخانے میں ڈلوا دیں اور جو امکان و عدم امکان کی بحثوں کا زخم کھا سکے۔ اگر دعوتِ توحید اور اقامتِ دین کا کام شروع کرنے سے پہلے امکانات کا جائزہ لینا صحیح ہوتا تو یقین جانئے کہ انبیاء کی ایک بڑی تعداد اپنے مشن کا نام بھی زبان پر نہ لاتی۔ اس کے لیے عملی جدوجہد کا تو کیا سوال پیدا ہوتا؟ کیونکہ انبیاء علیہم السلام اقامت دین کا مشن دے کر دنیا میں عموماً بھیجے ہی اُس وقت جاتے تھے جب اس کام کے لیے حالات کی ناسازگاریاں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی تھیں اور جب کلمہ حق کا نشوونما بظاہر ناممکن سے ناممکن تر ہو چکا ہوتا تھا۔ لیکن حالات کی ان شدید ناسازگاریوں اور امکانِ کامیابی کی بظاہر ان انتہائی کم یابیوں کے باوجود جن سے ہم اپنے زمانے کی ناسازگاریوں اور دقتوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتے' انہوں نے بلاتوقف کشتی سمندر میں ڈال دی' اور ذرا نہ سوچا کہ ساحل کہاں اور کدھر ہے؟ موسم پرسکون ہے یا طوفانی؟ ہوا موافق ہے یا مخالف؟ کشتی کھینچنے والے بازوؤں میں توانائی کتنی ہے؟ سمندر پیدا کنار ہے یا ناپیدا کنار؟ راستہ صاف ہے یا پانی کے اندر چٹانیں ہیں؟ اس طرح کا کوئی ایک بھی سوال نہ تھا' جس نے ان کے ذہنوں میں کبھی بار پایا ہو۔''

انقلابی نظریہ کی تمام تفصیلات ایک ہی بار سمجھ میں نہیں آ جایا کرتیں۔ اس کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں اور ان کی آگے تفصیلات ہوا کرتی ہیں۔ جب تک بات مکمل طور پر پہنچا اور سمجھا نہ دی جائے بعض اشخاص کا اجنبیت محسوس کرنا بُری بات نہیں ہے۔ ''خلافت'' کی اصطلاح سے اگر آج کوئی ابہام پیدا ہوتا بھی ہے تو اس کی بڑے پیمانے پر اشاعت سے اس کے دُور

ہونے کا یقینی امکان ہے۔ کیونکہ بعد ازاں سوال اور اعتراض کا جواب دینا بھی بہرحال اہلِ علم کی ذمہ داری ہے۔ چند آیاتِ قرآنیہ ملاحظہ ہوں:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ
فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾﴾ (الحج)

''(اے نبی ﷺ!) آپ سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اُس نے تمنا کی' شیطان اُس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ اُن کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔ اللہ علیم اور حکیم ہے۔ (وہ اس لیے ایسا ہونے دیتا ہے) تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے اُن لوگوں کے لیے جن کے دلوں کو (نفاق کا) روگ لگا ہوا ہے اور جن کے دل کھوٹے ہیں —— حقیقت یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ عناد میں بہت دور نکل گئے ہیں —— اور علم سے بہرہ مند لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے آپ کے ربّ ذوالجلال کی طرف سے اور اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اُس کے آگے جھک جائیں۔ یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔''

ان آیات کی وضاحت کے طور پر امام ابن تیمیہؒ کا ایک قول مجھے ملا ہے:

''جب تفصیل میں جایا جائے' ہر وضاحت طلب کی جائے تو راز منکشف ہو جاتے ہیں۔ رات دن سے واضح ہو جاتی ہے اور اہلِ ایمان و یقین اُن مدّلس دھوکے باز منافقین سے ممتاز ہو جاتے ہیں جو حق کو باطل سے خلط ملط کرتے ہیں اور جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہیں۔''

اہلِ علم جانتے ہیں کہ سفارتی زبان میں الفاظ کے معنی عام بول چال کی نسبت مختلف ہوا کرتے ہیں۔ سیاست کار اور سفارت کار (diplomats) اپنی تقریروں اور گفتگو میں بعض ایسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جن میں اصطلاح کے عام معنی اس بات کے عوامی اور صحافتی ابلاغ کے لیے ہوتے ہیں' جب کہ درحقیقت اسی کے اندر محذوف (implied)

معنی جو کہ بعض اوقات بالکل متضاد صورت حال پر منطبق ہوتے ہیں ان کا اصل مدعا ہوتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایک diplomat ان باتوں کو بآسانی decode کر کے قائل (speaker) کا اصل موقف سمجھ جاتا ہے (Political Euphemism)۔ حکومتیں اکثر اوقات تمدنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایسا کیا کرتی ہیں۔ ''جمہوریت'' کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے۔

خلافت کی اصطلاح احادیث میں بھی جا بجا آئی ہے اور قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے۔ قرآن وسنت کی بالادستی کے تحت جمہوریت کا نام لینا گناہ نہیں ہے' البتہ ہر نظریاتی قوم کو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ غیروں کی اصطلاحات سے گریز کرے۔ خلافت کی اصطلاح بڑی بابرکت ہے۔ یہ اصطلاح مسلمانوں کی وحدت اور یکجہتی کی ضرورت کو بھی اُجاگر کرتی ہے اور اسی وجہ سے عالمِ کفر اس سے خائف ہے۔

سابق امریکی سیکرٹری دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں کہتا ہے:

> *"We are up against a vicious enemy, the radical Islamists are there, they intend to try to create a* ***Caliphate*** *in this world and fundamentally alter the nature of nation states."*

اللّٰھم أرنا الحقّ حقّا وارزقنا اتّباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ!

''اے اللہ! ہمیں حق کو حق دکھا اور اس کی پیروی کرنے کی توفیق دے اور باطل کو باطل دکھا اور اس سے بچنے کی ہمت دے!''...... آمین یاربّ العالمین!

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے　　اشاعت عام: 25 روپے

اللہ کے لیے لفظ خدا کا استعمال

انجینئر حافظ نوید احمد

جناب سید محمد افتخار احمد صاحب نے ماہنامہ میثاق کے شمارہ بابت اگست ۲۰۱۲ء میں جناب سید رشید اللہ یعقوب صاحب کی کتاب ''اللہ اور خدا'' کی تلخیص کے بعد شمارہ دسمبر ۲۰۱۲ء میں ان ہی کی کتاب ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کی تلخیص تحریر کی ہے۔ اِس تلخیص کے مطابق اللہ کے لیے لفظ خدا کا استعمال قرآنِ حکیم کے حکم کی خلاف ورزی‘ رسول اللہ ﷺ کی سنّتِ مؤکدہ کو ترک کرنے کی جسارت اور آپؐ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کا جرم ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ علماء کرام اور مفکّرین اسلام اپنی تحریروں اور تقاریر میں کثرت سے اللہ کے لیے لفظ خدا کا استعمال کرتے رہے ہیں۔ رشید اللہ یعقوب صاحب کی کتابوں کی تلخیص پڑھ کر انتہائی تشویش ہوئی کہ کیا جیّد علماء کرام و مفکرین اسلام قرآن کے حکم کی نافرمانی‘ رسول اللہ ﷺ کی سنت مؤکدہ کی خلاف ورزی اور آپ ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کا جرم کرتے رہے ہیں؟ اسی تشویش کے پیشِ نظر راقم شہر کراچی کے سب سے بڑے دینی ادارے ''دارالعلوم کراچی'' گیا اور وہاں دارالعلوم کے نائب مفتی اور دارالافتاء کے سربراہ جناب مفتی عبدالمنان صاحب کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ مفتی صاحب نے فرمایا:

''رشید اللہ یعقوب صاحب کی بعض دینی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ اُنہوں نے خاص طور پر ''اسماء اللہ عزوجل‘ قرآن وحدیث کے مطابق'' کے عنوان سے بڑی عمدہ کتاب مرتب کی ہے۔ البتہ اُنہیں وہ علم اور صلاحیت حاصل نہیں جس کی بنیاد پر وہ کسی شے کے لیے جائز و ناجائز یا حلال وحرام کا فتویٰ دے سکیں۔ اُن کی طرف سے اللہ کے لیے لفظ خدا کے استعمال کو ناجائز قرار دینا اور اِس کے لیے فتویٰ کا اسلوب اختیار کرنا مناسب نہیں۔ فتویٰ دینے کا کام تو اُنہی لوگوں کا ہے جنہوں نے پوری زندگی علم دین کے حصول کے لیے وقف کی ہے اور فتویٰ دینے کے حوالے سے تمام ضروری علوم اور احتیاطیں سیکھی ہیں۔ پھر مستند مفتی حضرات کی رہنمائی میں فتویٰ دینے کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ دارالعلوم کراچی ربیع الاول ۱۴۱۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۹۳ء میں ''لفظ خدا استعمال کرنے کا حکم'' کے

عنوان سے ایک فتویٰ جاری کر چکا ہے۔ یہ فتویٰ مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب نے تحریر کیا تھا اور اِس کی تصدیق مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے کی تھی۔''

مفتی عبدالمنان صاحب نے راقم کو مذکورہ فتویٰ کی نقل بھی فراہم کی۔ اِس فتویٰ کے مطابق:

(۱) فارسی زبان میں لفظ ''خدا'' ذات باری تعالیٰ کے لیے موضوع ہے‘ جیسے ہر زبان میں ذات باری تعالیٰ کے لیے کوئی خاص لفظ وضع کیا جاتا ہے مثلاً انگریزی میں لفظ ''God'' ہے۔ لفظ خدا عربی نہیں کہ اسے قرآن وحدیث اور آثارِ صحابہؓ میں تلاش کیا جائے۔ یہ فارسی زبان کا مشہور لفظ ہے جو صدیوں سے فارسی اور اردو میں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ والاصفات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور سارے علماء وفقہاء‘ مفسّرین ومحدّثین اور متکلمین اِس کے استعمال کے جواز پر متفق ہیں۔

(۲) تحریر‘ تقریر اور گفتگو میں عربی کا استعمال افضل اور اقرب الی السُّنّہ ہے۔ لہٰذا لفظ خدا کو اللہ پر فوقیت نہیں دینی چاہیے‘ لیکن لفظ خدا کو اللہ کا مدمقابل بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ دونوں باتیں جہالت کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں افراط وتفریط سے محفوظ رکھے۔

(۳) یہ ایمان اور کفر کا مسئلہ نہیں‘ نہ یہ عقیدہ کی بات ہے‘ بلکہ یہ ایک فرعی مسئلہ ہے کہ عام گفتگو میں لفظ خدا کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ جب علماء امت کا اجماع ہے کہ عام گفتگو میں فی نفسہٖ یہ استعمال جائز ہے تو پھر علماء امت کی مخالفت کرنا اور اس پر اصرار کرنا درست نہیں۔

(۴) نماز میں یا تلاوتِ قرآن میں اللہ کو کسی اور لفظ سے تبدیل کرنا ناجائز وحرام ہے۔ اگر نعوذ باللہ عملاً یا استہزاءً ایسا کیا جائے تو کفر ہے‘ لیکن نماز اور تلاوتِ قرآن کے باہر جن جگہوں میں اللہ کا نام لے کر کام شروع کرنا چاہیے اُس میں بسم اللہ کی بجائے اس کا اردو یا فارسی یا اپنی مقامی زبان میں ترجمہ پڑھ لیا جائے تو بھی جائز ہے‘ اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی سنت ادا ہو جائے گی‘ اگرچہ عربی میں بسم اللہ پڑھنا افضل اور اوفق بالسنہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے اللہ اکبر کی بجائے فارسی زبان میں یا کسی اور زبان میں اللہ کا نام لے کر جانور ذبح کر دیا تو ذبیحہ جائز ہے (ہاں عربی میں بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ پڑھنا افضل ہے اور سنت کے مطابق ہے۔)

دارالعلوم کراچی کے علاوہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی اور مدرسہ قاسم العلوم ملتان سے بھی لفظ خدا کے استعمال کے جواز کے فتاویٰ دیے جا چکے ہیں۔ اِن فتاویٰ میں غیاث اللغات کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے کہ فارسی میں رب اور مالک کا ترجمہ خدا کیا جاتا ہے۔ یہ

لفظ صرف اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے' لیکن اضافت کے ساتھ غیر اللہ کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے' جیسے رب اور مالک کے اسماء اضافت کے ساتھ غیر اللہ کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

اب آیئے اُن دلائل کی طرف جو لفظ خدا کے استعمال کو ناجائز قرار دینے کے لیے مذکورہ تلخیص میں بیان کیے گئے ہیں:

(۱) اللہ کے لیے لفظ خدا یا God کا استعمال قرآنِ حکیم کے اِس حکم کی خلاف ورزی ہے کہ ﴿وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ﴾ (الاعراف: ۱۸۰) ''اور اُن لوگوں (کے طریق) کو چھوڑ دو جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد اختیار کیا ہے۔''

جواب: کسی بھی مسلمان سے پوچھ لیا جائے کہ لفظ خدا سے تمہارے ذہن میں کیا مفہوم آتا ہے؟ وہ یہی جواب دے گا کہ اِس سے اللہ کا تصور ذہن میں آتا ہے' نہ کہ کسی معبودِ باطل کا۔ ایسی صورت میں لفظ خدا کا استعمال ہرگز اللہ کے ناموں میں الحاد پیدا کرنے کے ذیل میں نہیں آتا۔ لفظ خدا اردو میں اچھے اور مقدس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر پکارو' تم جس نام سے بھی پکارو سارے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں''۔ (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

(۲) تحریر' تقریر اور گفتگو میں لفظ اللہ کا استعمال ہی سنت مؤکدہ ہے۔ جو لوگ اللہ کے لیے خدا یا God کا استعمال کرتے ہیں وہ سنت مؤکدہ کے تارک ہیں۔

جواب: اللہ کے رسول ﷺ کے کون سے افعال و اعمال سنت مؤکدہ قرار پاتے ہیں اِس کے لیے مناسب ہوگا کہ مستند فقہاء کی بیان کردہ تعریف سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ اگر سنت مؤکّدہ کا وہ تصور درست تسلیم کیا جائے جو تلخیص میں بیان کیا گیا ہے تو پھر صرف عربی زبان میں تحریر' تقریر اور گفتگو ہی سنت مؤکدہ قرار پائے گی۔ غیر عربی زبان میں لکھنا اور بولنا سنتِ مؤکّدہ کو ترک کرنے کے ذیل میں آئے گا۔ تلخیص میں صلوٰۃ کی جگہ لفظ نماز' صوم کی جگہ لفظ روزہ اور نبی یا رسول کی جگہ لفظ حضور استعمال کیا گیا ہے۔ کیا نبی اکرم ﷺ نے بھی نماز' روزہ اور حضور کے الفاظ استعمال کیے تھے؟ کیا اِن الفاظ کا استعمال بیان کردہ سنتِ مؤکدہ کے تصور کی رُو سے سُنّتِ مؤکّدہ کی خلاف ورزی نہیں؟

(۳) لوگ اپنی زندگی کے سب کاموں کے لیے تو سُنّتِ رسول ﷺ پر عمل کی کوشش کرتے ہیں' لیکن ایک غلط الاستعمال لفظ کو چھوڑنے کے لیے سُنّتِ رسول ﷺ کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: ''اے لوگو! میں تم میں دو چیزیں

چھوڑے جا رہا ہوں' جب تک اُن کو مضبوطی سے پکڑے رکھو گے کبھی گمراہ نہیں ہو گے: اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت''۔ ہم نے سنت رسول سے اچھی وفاداری نبھائی کے عباسی دور کے بعد ہی اللہ کو خدا کہنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے ''اللہ'' پر مجوسیوں' آتش پرستوں کے ''خدا'' کو فوقیت دینے لگے۔

جواب: اردو یا فارسی میں جو لوگ بھی خدا کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ اسے ہرگز غلط الاستعمال نہیں سمجھتے۔ لہٰذا اِس لفظ کا استعمال اگرچہ سنت کے مطابق نہیں لیکن سنت کے خلاف بھی نہیں۔ اگر مجوسی یا آتش پرست لفظ خدا کا استعمال معبودِ باطل کے لیے کرتے ہیں تو یہ اُن کا گمراہ کن تصور ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ''رب'' اللہ کے سوا آقا کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ خود قرآن نے بھی اِسے سورۂ یوسف آیات ۲۳، ۴۱، ۴۲ اور ۵۰ میں آقا کے لیے استعمال کیا ہے۔ کیا ہم اللہ کے لیے لفظ ''رب'' کا استعمال بھی ترک کر دیں کہ یہ غیر اللہ کے لیے استعمال ہو رہا ہے؟

(۴) اگر ہم عام آدمی کو نظر انداز بھی کر دیں تو اس عالم کا کیا کریں جو منبر رسول پر بیٹھا اپنے خطاب میں خدا خدا کی گردان کر رہا ہے۔ عام بیچارہ آدمی اسی کو سن کر تو تقلید میں خدا خدا کی گردان کرے گا۔ یہ بات تو ہمارے علماء کرام کے سمجھنے کی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت مؤکدہ کی اتباع کریں۔ علماء کرام کو چاہیے کہ اس فرمانِ الٰہی کو ہمیشہ یاد رکھیں: ﴿اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾﴾ (المائدۃ) ''تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے' اس وقت وہ تم کو تمہارے سارے کاموں سے جو تم دنیا میں کرتے رہے تھے آگاہ کر دے گا۔''

جواب: علماء کرام کے نزدیک اللہ کے لیے لفظ خدا کا استعمال جائز ہے۔ وہی اِس بات کے اہل ہیں کہ کسی فعل کے بارے میں جائز یا ناجائز ہونے کا فتویٰ دیں۔ اُن کے نزدیک لفظ خدا کا استعمال سنت مؤکدہ کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ لہٰذا اُنہیں لفظ خدا کے استعمال کے حوالے سے آخرت میں حساب کتاب کے حوالے سے ڈرانا مناسب نہیں ہے۔

(۵) ہر خواص و عام کو اپنی زندگی میں' اپنی تحریر و تقریر اور گفتگو میں اللہ تعالیٰ ہی کہنا چاہیے' خدا نہیں۔ افضل کو چھوڑ کر ادنیٰ کے استعمال پر مُصر رہنا تو یہود کی سنت ہے۔ (البقرۃ: ۶۱)

جواب: سورۃ البقرہ کی آیت ۶۱ کے مطابق یہود نے ناشکری کرتے ہوئے منّ و سلویٰ سے اکتانے کا اظہار کیا تھا اور زمین سے اگنے والی کم تر اشیاء فراہم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ کیا اللہ کے بجائے لفظ خدا کا استعمال بھی کسی ناشکری کی بنیاد پر ہے۔ اِس اعتبار سے سورۃ البقرہ کی آیت ۶۱ کا اطلاق یہاں ہرگز درست نہیں۔

(٦) ہمارے بعض علماء وَاللّٰہ کا ترجمہ ’’خدا کی قسم‘‘ کرتے ہیں......اُن کے اِس عمل سے ایک عام مسلمان یہ تاثر لیتا ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے بھی ’’خدا کی قسم‘‘ کہا تھا‘ جو سراسر غلط ہے۔ کیا یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کے زمرے میں نہیں آتا؟

جواب: جب کوئی عالم وَاللّٰہ کا ترجمہ ’’خدا کی قسم‘‘ کرتا ہے تو کوئی بھی سننے والا یہ نہیں سمجھتا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ’’خدا کی قسم‘‘ کہا ہو گا۔ ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ آپ ﷺ کی زبان عربی تھی اور آپ ﷺ عربی ہی میں گفتگو کرتے تھے۔ لہٰذا علماء کرام پر اللہ کے رسول ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کی وعید دراصل ایک بہت بڑا بہتان ہے‘ جس پر اللہ سے معافی مانگنی چاہیے۔ اگر تلخیص میں بیان کردہ موقف درست ہے تو پھر کسی حدیث کا ترجمہ ہی نہیں کرنا چاہیے۔ ہم جو بات اپنی زبان میں رسول ﷺ کی طرف منسوب کریں گے تو لوگ سمجھیں گے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے انہی الفاظ میں یہ حدیث ارشاد فرمائی ہو گی!

ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ لفظ خدا کی جمع ’’خدایان‘‘ بھی فارسی میں بولی جاتی ہے‘ جبکہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے‘ لہٰذا ایسا لفظ جس کی جمع بھی بولی جاتی ہو اللہ کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔ یہ دلیل بھی بہت سطحی قسم کی ہے۔ قرآن و حدیث میں اللہ کے لیے بار بار لفظ ’’رب‘‘ استعمال ہوا ہے۔ خود قرآن میں اِس لفظ کی جمع ’’ارباب‘‘ بھی بیان ہوئی ہے (التوبۃ:۳۱‘ یوسف:۳۹)۔ حدیثِ جبرائیلؑ میں اِس لفظ کی مؤنث ’’ربۃ‘‘ بھی بیان ہوئی ہے۔ کیا اب لفظ ’’رب‘‘ کو بھی اللہ کے لیے استعمال کرنا چھوڑ دیا جائے؟

آخر میں ایک بار پھر گزارش ہے کہ کسی بھی شے کے حلال و حرام یا جائز و ناجائز ہونے کا معاملہ اُن ہی ہستیوں کے حوالے کر دیا جائے جنہوں نے اِس حوالے سے مطلوبہ صلاحیت حاصل کرنے کے لیے زندگی کے کئی برس لگائے ہیں۔ حلت و حرمت کا معاملہ انتہائی نازک ہے۔ سورۃ النحل میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾﴾

’’اور نہ کہا کرو جیسے کہ تمہاری زبانیں جھوٹ گھڑتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے‘ تاکہ تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ منسوب کرو۔ بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑتے ہیں وہ کامیاب نہ ہوں گے۔‘‘

ظرافت کی حقیقت

اور بزرگوں کی خوش طبعی

حافظ گوہر ایوب گوہر

ظرافت اور مزاح انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے اور ہر انسان طبعی طور پر ہنسنے اور ہنسانے کو پسند کرتا ہے۔ ہمارا دین ''اسلام'' دینِ فطرت ہے اور یہ انسان کے فطری تقاضوں کے دروازے بند نہیں کرتا۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ((اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) ''تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے''، یعنی نفس کی ضرورتوں کو پورا کرنا بھی ایک مسلمان پر لازم ہے۔ نفس کی ایک ضرورت خوشی ہے، جس کے لیے اسلام میں ظرافت اور مزاح کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے، بلکہ اسے مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

سابقہ آسمانی محرف مذاہب میں جہاں ایک طرف انسان کو کھلی چھٹی دے دی گئی اور حلال وحرام کی تمیز اٹھا دی گئی، وہیں رہبانیت جیسی جاں گسل بدعت کو فروغ دیا گیا۔ رہبانیت کی رو سے نفس کی خواہشات کو مار دینا اور اسے ہر قسم کی لذات سے دور رکھنا درجہ ولایت کے حصول کا لازمی جزو ہے۔ اس میں شادی بیاہ، صفائی ستھرائی، اچھا لباس پہننے، ہنسنے، عمدہ کھانا کھانے کو جرم عظیم قرار دیا گیا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''پاکیزہ روحانی زندگی کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنے نفس کو بالکل مار دے اور اس میں جسمانی لذت کی کوئی خواہش تک باقی نہ رہے۔ ان لوگوں کے نزدیک خواہش کو مار دینا اس لیے ضروری تھا کہ اس سے حیوانیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ ان کے نزدیک لذت اور گناہ ہم معنی تھے، حتیٰ کہ مسرت بھی ان کے نزدیک خدا فراموشی کے مترادف تھی۔ سینٹ باسل ہنسنے اور ہنسانے تک کو ممنوع قرار دیتا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۵ سورۃ الحدید، حاشیہ ۵۴)

اسلام ایسی لایعنی اور بے مقصد پابندیوں سے آزاد اور پاک دین ہے۔ یہ انسان کی فطری راہوں کو بند نہیں کرتا البتہ انہیں شر سے خیر کی طرف موڑتا ہے۔ اسلام میں ظرافت کی اجازت دی گئی ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو، کسی کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو، کوئی فحش بات نہ کہی جائے، کوئی کفریہ کلمہ نہ بولا جائے۔ مزید یہ کہ ظرافت اور مزاح کو شغل نہ بنا لیا جائے، بایں طور کہ ہر وقت منہ پھلائے رکھنا اور ہنسنے ہنسانے کے درپے رہنا بھی جائز نہیں۔ اس حوالے سے مشہور شارح حدیث امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''(اسلام میں) اس مزاح کی مذمت کی گئی ہے جو دل کی سختی کا باعث بنے یا اللہ تعالیٰ کی یاد سے روکنے اور مسلمانوں کو ایذا دینے والا ہو۔ اور جو مزاح اس سے خالی ہو اور دوسرے کی دلجوئی اور خوشی کا سبب ہو وہ نہ صرف جائز ہے بلکہ قابلِ تحسین کام ہے۔''

نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے خود بھی مزاح فرمایا ہے اور صحابہ کرام ؓ سے بھی ظریفانہ اقوال ملتے ہیں۔ علمائے نفسیات نے انسان کی اعلیٰ صفات میں سے ایک صفت مزاح کا بھی ذکر کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خشک اور روکھی طبیعت کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا اور نہ ہی یہ کوئی کمال ہے کہ انسان کے چہرے پر کبھی ہنسی نہ آئے۔ علمائے اُمت نے بھی ظرافت کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی ہے، بلکہ اس کو اپنایا بھی ہے۔ علامہ ابن جوزیؒ نے ایک کتاب بعنوان 'اخبار الحمقٰی والمغفلین' لکھی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے احمقوں کے سچے واقعات لکھے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں:

''تیسری وجہ اس کتاب کے لکھنے کی یہ ہے کہ انسان ان ناقص لوگوں کے کردار کو دیکھ کر دل خوش کر سکے، اس لیے کہ دل بعض دفعہ تھک جاتا ہے اور جائز شغل میں لگنے سے خوشی محسوس کرتا ہے۔''

اس کے بعد ابن جوزی نے بہت سے لوگوں کے اقوال نقل کیے ہیں، جنہوں نے نہ صرف ظرافت کی حوصلہ افزائی کی بلکہ اس کی رغبت بھی دلائی۔ مثلاً حضرت ابن عباس ؓ جب شاگردوں کے ساتھ بیٹھتے تو دین کی باتیں کرنے کے بعد فرماتے: اب کچھ مزاح کی باتیں سناؤ، پھر عربوں کی کہانیوں میں لگ جاتے اور ایسا محفل میں کئی بار کرتے۔ ابن شہاب زہری فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ اپنے ساتھیوں سے فرماتے: اشعار پیش کرو، دلچسپ باتیں پیش کرو، کیونکہ کان ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور مزاح کی طرف توجہ کرنے لگتے ہیں۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ امام زہری جب حدیث بیان کرتے تھک جاتے تو فرماتے

مذاق پیش کرو‘ اشعار سناؤ اور ایسی باتوں میں لگ جاؤ جو تمہارا دل ہلکا کریں۔ عطار بن یسار کبھی ساتھیوں کو رونے پر مجبور کر دیتے اور کبھی باتوں باتوں سے ہنسا دیتے۔ حماد بن سلمہ کہتے ہیں کہ ہارون الرشید کہا کرتے تھے کہ ظرافت کو وہی لوگ پسند کرتے ہیں جن میں مردانگی ہو اور وہی لوگ ناپسند کرتے ہیں جن میں زنانہ پن ہو۔

ان اقوال سے یہ بات ظاہر ہے کہ ظرافت تعلیمات اسلام کے منافی نہیں‘ مگر اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ ہنسنے‘ ہنسانے اور گپ شپ کو ایک شغل بنا لینا‘ کثرت سے ہنسنا اور قہقہے لگانا مکروہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ((وَلَا تُكْثِرِ الضَّحِكَ ، فَإِنَّ كَثْرَةَ الضَّحِكِ تُمِيتُ الْقَلْبَ)) (سنن الترمذی) ”زیادہ مت ہنسا کرو‘ کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مُردہ کر دیتا ہے“ —— عربی زبان کا محاورہ ہے کہ مذاح کلام میں ایسے ہے جیسے کھانے میں نمک۔ اب اگر کھانے میں نمک نہ ہو تو کھانا بدمزہ ہوگا اور اگر نمک زیادہ ہو جائے تو وہ کھانا بے کار ہو جائے گا —— لہٰذا دورانِ گفتگو ظرافت کو اعتدال پر رکھنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے جہاں زہد و ورع کو اپنایا‘ خشیت کو اختیار کیا‘ لغو کلام اور ہزلیات سے پرہیز کیا‘ وہیں ان بزرگوں سے حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت پُرمزاح اور بذلہ سنج گفتگو بھی ثابت ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا مزاحِ لطیف

سب سے پہلے میں اپنے پیارے حبیب فداہ ابی و امی ﷺ کے مزاحِ لطیف کا تذکرہ کروں گا۔ آپؐ نے بعض مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مزاح فرمایا اور آپؐ کا مزاح بھی حق اور سچ پر مبنی تھا۔ علماء نے رسول اللہ ﷺ کے مزاح کی بہت سی حکمتیں بیان کی ہیں‘ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگ آپؐ سے مانوس ہو جائیں اور خوف نہ کھائیں۔ چونکہ آپؐ کی مبارک شخصیت رعب اور جلال والی تھی‘ اس لیے آپؐ کبھی مزاح بھی فرماتے تھے۔ آپؐ کی خوش طبعی اور مزاح سے بھی فقہاء نے مسائل کا استنباط کیا ہے۔ گویا آپؐ کا مزاح بھی دینی تعلیم سے خالی نہ تھا۔ اس سلسلے میں چند واقعات ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔

☆ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ میرے حجرے میں تھے اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں موجود تھیں۔ میں نے دودھ سے حریرہ تیار کیا اور حضرت سودہ سے کھانے کو کہا۔ انہوں نے کہا: مجھے پسند نہیں ہے۔ میں نے کہا کھاؤ ورنہ

میں آپ کے چہرے پر مل دوں گی۔ انہوں نے انکار کیا تو میں نے تھوڑا سا حریرہ ان کے چہرے پر مل دیا۔ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ اب میں وہاں سے نکلنا چاہتی تھی کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی ٹانگ مبارک آگے رکھ دی اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تم بھی عائشہ رضی اللہ عنہا کے چہرے پر مل دو۔ انہوں نے پیالہ میں سے تھوڑا سا حریرہ لے کر میرے چہرے پر مل دیا اور حضور اکرم ﷺ مسکراتے رہے —— اس واقعہ میں شوہر کا نرم طبع ہونا‘ بیویوں سے دل لگی کرنا‘ ان میں کینہ پیدا نہ ہونے دینا اور اس جیسے دوسرے اسباق موجود ہیں۔

☆ اُمِ ایمن نامی ایک صحابیہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ کو میرے شوہر بلا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تیرا شوہر وہی تو نہیں جس کی آنکھ میں سفیدی ہے۔ اس نے کہا میرے شوہر کی آنکھیں تو ٹھیک ہیں‘ ان میں تو سفیدی نہیں ہے۔ آپؐ نے دوبارہ فرمایا کہ سفیدی ہے۔ اس عورت نے قسم کھا کر کہا کہ نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کوئی انسان ایسا نہیں جس کی آنکھ میں سفیدی نہ ہو۔

☆ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھی۔ اس وقت میرا وجود ہلکا پھلکا تھا اور بدن پر گوشت بہت کم تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ تم لوگ آگے چلے جاؤ۔ آپؐ نے مجھ سے فرمایا: آؤ میں تم سے دوڑ میں مقابلہ کروں۔ چنانچہ ہم دونوں میں مقابلہ ہوا‘ میں دبلی تھی اس لیے حضور ﷺ سے آگے نکل گئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایک مرتبہ پھر میں آپ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھی۔ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا: تم آگے چلے جاؤ۔ اس کے بعد ہم دونوں میں پھر دوڑ کا مقابلہ ہوا۔ تب میرا وجود بھاری ہو چکا تھا‘ اس لیے میں پیچھے رہ گئی۔ حضور اکرم ﷺ آگے نکل گئے اور مسکراتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ یہ پہلی دوڑ کا بدلہ ہو گیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاحِ لطیف

نبی معظم ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رتبہ ہے۔ اصحابِ رسولؐ بھی ایک دوسرے کے ساتھ مزاح کیا کرتے تھے۔ ذیل میں چند ایک واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

☆ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ کیا صحابہؓ بھی آپس میں مزاح کیا کرتے تھے؟ فرمایا کہ ہاں مزاح کرتے تھے مگر ایمان ان کے دلوں میں پہاڑوں سے زیادہ مضبوط تھا۔ صحابہ کرامؓ مذاق میں ایک دوسرے پر خربوزے کے چھلکے پھینکتے تھے اور کبھی دوڑ کا

مقابلہ کرتے اور ہنستے تھے۔ معروف تابعی حضرت امام مکحولؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ایک آدمی کو چھینک آئی۔ حضرت ابن عمرؓ نے مزاحاً کہا کہ اگر تم نے الحمدللہ کہا تو پھر یرحمک اللہ!

☆ ایک مرتبہ حضرت صہیب ؓ کی آنکھ میں درد تھا اور وہ کھجور کھا رہے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ میں درد ہے اور تم کھجوریں کھا رہے ہو۔ انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ میں دوسری آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں۔ آپ ﷺ اس جواب پر مسکرانے لگے۔

☆ ایک صحابی حضرت ضحاک ؓ بہت خوبصورت نہ تھے۔ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئے۔ حضرت عائشہ ؓ بھی موجود تھیں اور ابھی پردے کے احکام نہیں اترے تھے۔ حضرت ضحاکؓ نے مزاح میں نبی کریم ﷺ سے کہا کہ میری دو بیویاں ہیں اور وہ دونوں حضرت عائشہ سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں ایک کو طلاق دے دیتا ہوں اور آپؐ اس سے نکاح کر لیں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ وہ زیادہ خوبصورت ہیں یا تم؟ حضرت ضحاکؓ نے کہا کہ میں ان دونوں سے زیادہ خوبصورت ہوں۔ نبی کریم ﷺ ان دونوں کی باتوں سے مسکرانے لگے۔

بزرگوں کی ظریفانہ گفتگو

علمائے اُمت بھی بے ضرر اور نفیس مزاح کیا کرتے تھے۔ حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانویؒ ذومعنی الفاظ اور رعایتِ لفظی سے مزاح پیدا کرتے۔ حضرت تھانوی سے کسی نے کہا کہ میں ابدال ہو گیا ہوں۔ فرمایا کہ پہلے گوشت تھے‘ اب دال ہو گئے ہو —— کان پور میں ایک بوڑھے آدمی نے حضرت تھانوی سے پوچھا کہ وتروں کے بعد ”سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوس“ کہنا کیسا ہے؟ فرمایا کہ مسنون ہے‘ حدیث سے ثابت ہے۔ وہ بوڑھا کہنے لگا کہ وہ حدیث تو ضعیف ہے۔ مولانا نے کہا کہ تم بھی تو ضعیف ہو‘ تم کون سے قوی ہو —— ایک آدمی نے پوچھا کہ حضرت جنت میں حقہ ہو گا؟ مولانا تھانوی نے کہا کہ حقہ تو ہو گا مگر آگ لینے کے لیے جہنم میں جانا پڑے گا —— حضرت تھانوی نے ایک مرتبہ مزاحاً کہا کہ انسانوں نے جانوروں کے نام رکھ لیے ہیں۔ کوئی بلبلِ ہند ہے‘ کوئی شیرِ پنجاب تو کوئی طوطیٔ ہند ہے۔ اب آئندہ کوئی اسپِ ہند ہو گا تو کوئی فیلِ ہند۔

☆ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اپنی محافل میں لطیف مذاق کیا کرتے۔ سید اسعد گیلانی رقم طراز ہیں:

”سید مودودی کی مجلس کا ایک پہلو پر لطف مزاح ہے۔ مخاطب کو بے تکلف کرنے کے لیے وہ چٹکی لینے کی بجائے مسکراہٹ کا شگفتہ پھول پیش کرتے ہیں۔“

ایک دفعہ سید مودودی اپنے بیٹے اور ماہر القادری کے ساتھ کار میں کہیں جا رہے تھے۔ آپ کا بیٹا بار بار پرزوں کا ذکر کر رہا تھا۔ مولانا ماہر القادری نے کہا کہ آپ کو تو اس فن میں کمال حاصل ہے۔ سید مودودی نے مسکراتے ہوئے کہا: ہاں‘ باپ مولوی اور بیٹا لوہار —— ایک آدمی نے مولانا سے کہا کہ اخبارات سرکاری خبر تو دیتے ہیں مگر ہماری خبر نہیں دیتے۔ مولانا نے ان سے کہا کہ وہ ان کی خبر دیتے ہیں اور ہماری خبر لیتے ہیں —— ایک بار مولانا مودودیؒ کی گرفتاری ہوئی تو کہا کہ بھائی پان کی ڈبیہ لانا‘ آخری بار پان کھا لوں۔ کسی نے کہا کہ آخری بار کیوں؟ فرمایا کہ پان کو طلاق دے رہا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ طلاق رہائی کے بعد بھی ہو گی؟ ہنس کر کہا کہ یہ طلاق رجعی ہے‘ مغلظ نہیں۔

☆ شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی مجلس میں کسی نے کہا کہ انگریز کہتے ہیں داڑھی رکھنا فطرت کے خلاف ہے‘ کیونکہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو داڑھی نہیں ہوتی۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ پھر وہ اپنے دانت بھی توڑ دیں‘ کیونکہ جب پیدا ہوئے تھے تو دانت بھی تو نہ تھے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ واہ حضرت! کیا خوب دندان شکن جواب دیا ہے۔

☆ کراچی کے مشہور بزرگ حکیم محمد اختر (خلیفہ شاہ عبدالغنیؒ) ایک مرتبہ سیر کو نکلے۔ راستے میں ایک مرغ پر نظر پڑی۔ حکیم صاحب نے مزاحیہ انداز میں فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

اے مرغِ چمن ایک نظر میری طرف بھی!
مدت ہوئی ہے سبزیاں کھاتے ہوئے مجھے

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پیارے پیغمبر ﷺ کی مبارک تعلیمات پر چلنے کی توفیق عنایت کرے اور اکابرین کی صفاتِ حمیدہ اور اوصافِ عالیہ کو اپنانے کی سعادت عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

مآخذ و مصادر:

☆ تفہیم القرآن ☆ اخبار الحمقٰی والمغفلین (ابن جوزی)
☆ مزاح النبی ﷺ والصحابة ☆ اشرف اللطائف ☆ سید مودودی

والدین کے فرائض، اولاد کے حقوق

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

والدین کے فرائض: قرآنی آیات کی روشنی میں

(۱) ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَ اَهۡلِیۡکُمۡ نَارًا......﴾ (التحریم:۶)

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ......''

(۲) ﴿وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ......﴾ (الانفال:۲۸)

''جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد فتنہ (آزمائش) ہیں......''

(۳) ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِکُمۡ وَ اَوۡلَادِکُمۡ عَدُوًّا لَّکُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ ۚ﴾ (التغابن:۱۴)

''اے ایمان والو! بے شک تمہارے ازواج اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن ہیں، سو تم ان سے بچتے رہو۔''

(۴) ﴿اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَهۡوٌ وَّ زِیۡنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ﴾ (الحدید:۲۰)

''جان لو کہ دنیا کی زندگی کھیل کود، تماشا، زینت، فخر و تفاخر اور مال و اولاد میں کثرت کی طلب ہے۔''

مندرجہ بالا آیات سے والدین کے فرائض اور اولاد کے حقوق کی بہترین نشاندہی ہوتی ہے۔ ان میں آیات پیدائش سے لے کر تادمِ آخر اولاد کے حقوق کو بہت جامع انداز میں سمو دیا گیا ہے اور مثبت اور منفی دونوں لحاظ سے خبردار بھی کیا گیا ہے۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ تمہارا مقصدِ حیات یہ ہے کہ خود کو اور اپنی اولاد کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اس اعتبار سے اُخروی نجات میں والدین اور اولاد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر والدین خود عذابِ الٰہی سے بچنے کی

تگ و دو کرتے ہوں گے تو لازماً اولاد کے لیے بھی وہی پسند کریں گے۔ سورۃ الانفال کی متذکرہ بالا آیت میں منفی انداز سے خبردار کیا گیا ہے کہ مال و اولاد کی محبت میں حد سے بڑھنے سے بچتے رہنا، اس لیے کہ یہ فتنہ ہیں، جس پر اصل میں تم پرکھے جا رہے ہو کہ تم ان کے ساتھ مخلص ہو کہ نہیں! مزید یہ جان لو کہ یہ اولاد تمہاری دشمن بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ میرے محدود خیال کے مطابق دشمنی کے دو مطلب بنتے ہیں۔ ایک یہ کہ اولاد کی محبت، ان کی خواہشات، مطالبات اور فرمائشیں انسان کو حلال سے حرام کمائی کی طرف لے جا سکتی ہیں۔ اس اعتبار سے تمہاری اولاد گویا تمہارے ساتھ دشمنی کر رہی ہے۔ دشمنی کا دوسرا پہلو نہایت خوفناک ہے کہ اولاد کی جائز و ناجائز خواہشات کو عملی جامہ پہناتے پہناتے انسان جب اللہ کے حضور محاسبے کے لیے کھڑا ہو گا تو یہی اولاد اپنے والدین کا گریبان پکڑے ہوئے نظر آئے گی۔ قرآن مجید میں اس ناکامی کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

(۱) ﴿یَوَدُّ الۡمُجۡرِمُ لَوۡ یَفۡتَدِیۡ مِنۡ عَذَابِ یَوۡمِئِذٍۭ بِبَنِیۡهِ ﴿۱۱﴾ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ اَخِیۡهِ ﴿۱۲﴾ وَ فَصِیۡلَتِهِ الَّتِیۡ تُــٔۡوِیۡهِ ﴿۱۳﴾ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ۙ ثُمَّ یُنۡجِیۡهِ ﴿۱۴﴾﴾ (المعارج)

''گنہگار خواہش کرے گا کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے دے (یعنی) اپنے بیٹے، اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی، اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا، اور جتنے آدمی زمین میں ہیں (غرض) سب (کچھ) دے دے اور اپنے تئیں عذاب سے چھڑا لے۔''

(۲) ﴿یَوۡمَ یَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِیۡهِ ﴿۳۴﴾ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیۡهِ ﴿۳۵﴾ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیۡهِ ﴿۳۶﴾﴾ (عبس)

''اس دن آدمی دور بھاگے گا اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں سے، اور اپنے باپ سے، اور اپنی بیوی سے، اور اپنے بیٹے سے۔''

اولاد کے حقوق

اولاد کے پیدا ہونے سے لے کر تادمِ آخر ذہنی و فکری، جسمانی و قلبی تعلیم و تربیت، تزکیہ اور اعمال کو صالح بنانے کی کوشش کرنا، یہ سب اولاد کے حقیقی اور دائمی حقوق ہیں، جن کا تعلق نہ صرف دنیوی بہتری بلکہ اخروی کامیابی اور راحت و سکون سے ہے۔ اولاد کو کھلانا، پلانا، پہنانا، رہنا سہنا، ان کی پرورش کرنا، یہ سب والدین کے ذمے ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق اعتدال پر مبنی زندگی خود بھی اپنائیں اور اولاد کے لیے بھی پسند کریں۔ خصوصاً بیٹے اور بیٹیوں میں

مساوات اختیار کریں۔ چونکہ اکثر والدین کے خیال میں بیٹے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں‘ لہٰذا ان کو ہر معاملے میں بیٹیوں پر فوقیت دی جاتی ہے جو شرعاً غلط ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بیٹوں کو ان کے دائرہ کار کے مطابق تعلیم دلوائیں —— چونکہ انہوں نے معاش اور دوسری ضروریاتِ زندگی سے نبرد آزما ہونا ہے لہٰذا ان کی تعلیم میں اس نہج پر توجہ دینا ضروری ہے —— اور لڑکیوں کو ان کے دائرہ کار کے مطابق تعلیم دلوائیں اور جن رشتوں سے ان کو زندگی بھر واسطہ پڑتا ہے‘ ان کے حقوق وفرائض کے بارے میں ان کو ضرور آگاہ کریں۔ جوان ہونے پر مناسب اور دیندار رشتے دیکھ کر بغیر کسی تاخیر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔ شادی کے بعد برسرروزگار ہونے کی وجہ سے لڑکے اپنے معاش کے ذمہ دار خود ہیں‘ جبکہ لڑکیاں اپنے شوہروں کی ماتحتی میں ہونے کی وجہ سے معاش کی تگ و دو سے فارغ ہوتی ہیں اور ان کا نان نفقہ شوہر کے ذمے ہے۔ اس کے باوجود بوقت ضرورت اگر لڑکیاں کسی ضرورت کے تحت والدین سے کچھ مطالبہ کرتی ہیں تو حسب استطاعت ان کو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تربیتِ اولاد میں والدہ کا کلیدی کردار

اولاد کو بہترین انسان بنانے کی ذمہ داری اگرچہ ماں باپ دونوں پر ہوتی ہے‘ لیکن یہ ذمہ داری ماں پر بنسبت باپ کے کچھ زیادہ ہے۔ وہ اس طرح کہ اولاد کا اندازِ گفتگو‘ اعمال اور فکروسوچ کا مرکز ومحور والدہ ہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے بھی ماں کو اپنی اولاد پر نگران قرار دیا ہے۔

((وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ))(۱)

’’عورت نگران ہے اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد پر اور قیامت کے دن اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔‘‘

اسی طرح ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک بیوہ عورت اگر اپنے بچوں کی خاطر دوسری شادی نہیں کرتی تو وہ جنت میں بہت اعلیٰ مقام کی حق دار ہے‘ حالانکہ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ (النور:۳۲) ’’اور اپنی قوم کی بیواؤں کا نکاح کر

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الاحکام‘ باب قول اللّٰہ تعالیٰ ﴿واطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم﴾۔

دیا کرو‘ لیکن نبی اکرم ﷺ نے بچوں والی کے لیے شادی کرنے سے بچوں کی تربیت کرنا زیادہ افضل قرار دیا ہے۔ جبکہ مرد کے لیے ایسا کوئی حکم ہے ہی نہیں‘ بلکہ انہیں تو ایک ایک وقت میں چار‘ چار بیویوں کی اجازت ہے۔ اس کی ایک وجہ وہ بے پناہ محبت اور مامتا یعنی بچوں سے بہت زیادہ پیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے مردوں کی بجائے ماؤں میں بہت زیادہ رکھا ہے۔ ماں چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم‘ جانور ہو یا چرند پرند اس کی مامتا مشہور ہے۔ بلی اپنے بچے کی حفاظت کرتی ہے خواہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے‘ چڑیا سارا دن اپنی چونچ میں دانے لے کر اپنے بچے کو کھلاتی ہے خود چاہے بھوک سے ہلکان ہو جائے۔ اسی طرح عورت جب ماں بنتی ہے تو اپنے بچے کے لیے بے انتہا مہربان‘ شفیق‘ محبت کرنے والی ہوتی ہے۔ عام طور پر راتوں کو جاگتی ہے‘ بچے کے لیے تکالیف اٹھاتی ہے‘ بیماری میں بچے کی دیکھ بھال زیادہ تر وہی کرتی ہے۔ وہ خود بھوکی رہ لے گی لیکن بچے کو ضرور کھلائے گی‘ اپنے تن پر کپڑا نہ بھی ہو لیکن اولاد کو ٹھنڈ سے ضرور بچائے گی (استثناءات ہر جگہ ہیں)۔ یہ تمام اعمال غیر اختیاری افعال ہیں۔ اس میں اس کو جبراً یا مارے باندھے یا کسی کے کہنے پر کچھ نہیں کرنا پڑتا‘ بلکہ یہ اس کی مامتا ہے جو اللہ نے اس کے اندر رکھ دی ہے۔ وہ ان تمام کاموں پر کوئی معاوضہ بھی کسی سے نہیں چاہتی‘ بلکہ دیوانوں کی طرح ہلکان ہو کر یا تھک کر جب بچے کو دیکھتی ہے تو اس کی تمام تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ پھر اس بات پر وہ بچے کے باپ یا کسی سے بھی نہ شکریے کی طلب گار ہوتی ہے اور نہ کسی اجرت کی۔

اسی محبت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ماں کے بے انتہا لاڈ پیار سے بچے کہیں بگڑ نہ جائیں تو عورت کو ہی بچوں کا نگران بنا دیا گیا اور ان کو اچھا انسان بنانے کی ذمہ داری بھی ماں کو دے دی گئی۔ اس لیے کہ ماں ہی پیار محبت سے بچوں کو راہِ ہدایت پر لانے کی کوشش کر سکتی ہے۔ مرد وہ پیار دے ہی نہیں سکتا جو ایک ماں اپنی اولاد کو دے سکتی ہے‘ لہٰذا مطلوبہ تربیت بھی مرد نہیں کر سکتا —— مرد کے مزاج میں چونکہ غصے کا عنصر زیادہ ہوتا ہے اس لیے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سارا دن بچہ ماں کے پاس ہوتا ہے تو وہ اس کی شرارتوں کے باوجود اسے نہیں مارتی‘ جبکہ باپ بہت جلد بچے سے بیزار ہو جاتا ہے اور بسا اوقات غصے میں مار بیٹھتا ہے —— بچے والی بیوہ ماں کے لیے شادی نہ کرنے میں جو افضلیت بتائی گئی اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اگر وہ شادی کر لیتی ہے تو بچوں کے ساتھ محبت اور شفقت میں لامحالہ کمی آئے گی جو بچوں کی تعمیرِ شخصیت کا لازمی حصہ ہے۔

ویسے تو ممتا اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطیہ ہے‘ لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ مسلم اور غیر مسلم ماں کے پیار میں نمایاں فرق ضرور ہے‘ بایں طور کہ ایک غیر مسلم ماں اپنے بچے کو اس دنیا کے لیے تیار کرتی ہے اور اسے اچھی دنیوی تعلیم‘ معاشرے میں رائج اچھے آداب‘ اچھی ملازمت اور بالآخر دنیا دار خاتون (جس کے پاس پیسہ ہو‘ دُنیوی تعلیم ہو‘ خوبصورتی ہو) سے شادی کرا کر بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک مسلمان ماں اپنے بچے کو دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کے لیے بھی تیار کرتی ہے۔ اس کی محبت کے ہر پہلو میں اس کی اصلاحِ باطنی‘ اعمال کی درستگی (سنت رسول ﷺ کے مطابق)‘ اخلاقیات کی تعلیم اور ایسی رفیقہ حیات (بچی کے لیے رفیقِ حیات) کا انتخاب جو اس کو آخرت کی کامیابی میں ممد و معاون بنانے والی ہو/والا ہو‘ یہ سب کچھ نظر آتا ہے۔ گویا ایک غیر مسلم ماں صرف زمین کے لیے اور مسلمان ماں آسمانوں کے لیے (کہ صرف اہلِ ایمان کے لیے آسمانوں کے دروازے کھولے جائیں گے) اپنا تن من دھن لگا دیتی ہے‘ قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتی ہے اور دعاؤں میں اولاد کو یاد رکھتی ہے۔

تربیتِ اولاد میں والد کا کردار

ماں کے ساتھ ساتھ والد کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اولاد کی تربیت میں اپنا حصہ ڈالے‘ اس لیے کہ اولاد (خصوصاً بیٹے) بڑے ہو کر اکثر باپ کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ صرف جسمانی ضروریات کا خیال رکھنا ہی ایک باپ کی ذمہ داری نہیں ہے‘ بلکہ بری عادات (سگریٹ نوشی‘ پان‘ بہت زیادہ دوستیاں‘ بلاوجہ گھر سے باہر رہنا وغیرہ) سے خود بھی بچنا اور بچوں کو بھی بچانا والد کے فرائض میں شامل ہے۔ ماقبل بیان کردہ سورۃ التحریم کی آیت سے ہمیں یہی تعلیم ملتی ہے کہ اولاد کو دوزخ کی آگ سے بچانا مرد و عورت دونوں پر فرض ہے۔ مزید ان کو نماز کی طرف راغب کرنا‘ لڑکے ہوں تو خود ساتھ لے کر مسجد میں جانا‘ ان کے دوستوں کے بارے میں معلومات رکھنا‘ ان کو اچھی صحبت کی طرف راغب کرنا بھی والد کے فرائض میں شامل ہے۔ بچوں میں اخلاقِ حسنہ مثلاً سچائی‘ خوش گفتاری وغیرہ جیسی عبادات میں بھی خلوص سے حصہ ڈالنا والد کے فرائض میں شامل ہے۔ اگر یہ اوصاف خود والد یا والدہ میں موجود ہوں تو سونے پہ سہاگا والی بات ہوگی۔

دورانِ حمل والدہ کا کردار

آج کے سائنسی دور میں یہ بھی منکشف ہو چکا ہے کہ قبل از ولادت رحم مادر میں بھی بچہ

بہت کچھ سیکھتا ہے‘ سنتا ہے‘ ماں کی آواز پہچانتا ہے اور ولادت کے بعد ماں کی آواز اس کو مانوس سی لگتی ہے۔ لہٰذا حمل کے دوران والدہ کو چاہیے کہ بہت مثبت سوچ رکھے۔ قرآنی آیات‘ ادعیہ ماثورہ‘ اذکارِ مسنونہ کا اہتمام کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بچے کے نارمل اور صحت مند پیدائش کی دعائیں کرنا ضروری ہے۔

والدہ ہونے کی حیثیت سے حمل کے مراحل میں بچے کا تعلق سب سے زیادہ ماں سے ہوتا ہے‘ لہٰذا بچے کی نشوونما‘ پرورش اور تربیت میں بھی والدہ کا حصہ زیادہ ہے۔ حمل کے دوران اور ولادت کے بعد بھی بچوں کے کانوں میں (اذان اور اقامت کے علاوہ) سب سے زیادہ آواز ماں ہی کی آتی ہے۔ لہٰذا اس کمرے میں جہاں نومولود بچہ موجود ہو‘ قرآنی آیات اور ادعیہ ماثورہ وغیرہ کی تلاوت کرتے رہنا چاہیے‘ نہ کہ موسیقی‘ گانا بجانا وغیرہ۔ یہ تو شیطانی عملیات ہیں اور شیطان یہی چاہتا ہے کہ بچہ شروع دن سے ہی ان برائیوں کا عادی ہو جائے۔

والدین کی ذمہ داریاں

بچے کے کان میں اذان اور اقامت کے بعد سات دن کے اندر اندر نام رکھنا‘ سر منڈوانا‘ عقیقہ کرنا اور اگر لڑکا ہو تو ختنہ کرنا‘ مسنون اعمال ہیں اور ان کو سرانجام دینا والدین کی اولین ذمہ داری ہے۔ ناموں کے بارے میں تو خصوصی تاکید آئی ہے کہ نام ایسے رکھے جائیں جن کا مطلب اچھا ہو‘ یا پھر انبیاء کرامؑ‘ صحابہ کرامؓ‘ صحابیاتؓ‘ اُمہات المؤمنینؓ یا کسی بزرگ وغیرہ کے نام کی مناسبت سے نام رکھا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عبداللہ اور عبدالرحمٰن بہت پیارے نام ہیں۔ کسی نے نبی کریم ﷺ سے ’’محمد‘‘ نام رکھے جانے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ’’محمد‘‘ نام بھی رکھ لیتے ہو اور پھر بعد میں اُسے برا بھلا بھی کہتے ہو! مزید یہ کہ جب بچہ بولنا سیکھ جائے تو اس کو لا الٰہ الا اللہ سکھانا‘ جب وہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو نماز کی طرف احسن طریقے سے راغب کرنا والدین کے فرائض میں شامل ہے۔

ان کے ساتھ ساتھ دس سال کی عمر میں نماز اور بلوغت کے بعد روزے کی ترغیب‘ زکوٰۃ کی حسبِ توفیق تاکید کہ جب وہ خود کمانے لگ جائیں‘ اور حسبِ استطاعت حج کی ترغیب و تشویق دلاتے رہنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے تمام اعمال کو اعمالِ صالحہ بنانے کی بھرپور کوشش کرنا‘ خود والدین کی زندگی کے بھی آخری دموں تک یہ فریضہ ادا کرنا اولاد کے اولین حقوق اور والدین کے اوّلین فرائض میں شامل ہے۔

بچپن سے اولاد کی تربیت ضروری ہے

بچپن میں بچے کا دماغ ایک کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ))(۱)

''ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ماں باپ ہی اس کو یا تو یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی یا مجوسی۔''

بچے اتنی صاف فطرت کے ہوتے ہیں کہ ان کے دل و دماغ میں کوئی کجی' ٹیڑھ پن یا برائی نہیں ہوتی اور والدین انہیں اپنے اپنے خیالات اور مذہب کی طرف مختلف طریقے سے راغب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچوں کی فطرت صاف کاغذ کی طرح ہوتی ہے۔ اب اس سفید کاغذ پر بہترین کارآمد چیزیں بھی لکھی جا سکتی ہیں اور گندی' ناپاک اور نجس چیزیں بھی۔ اس طرح والدین اپنے بچوں کو پارسا بھی بنا سکتے ہیں اور شیطانی صفات کا حامل بھی۔

ہمیں نہ تو اپنی زندگی کے بارے میں کوئی گارنٹی دی گئی ہے اور نہ ہماری اولاد کے بارے میں ــــــ ہو سکتا ہے کہ ہماری اولاد زندگی کے ابتدائی سالوں میں ہی اللہ کی طرف بلا لی جائے کہ یہ تو اسی کی امانت ہے ــــــ تو شروع دن سے ہی اولاد کی بہترین تربیت' نیک اعمال اور اچھے علم کی طرف توجہ رہے گی تو اولاد کا نہ صرف حق ادا ہوتا رہے گا' بلکہ محبت کرنے والے مسلمان والدین کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا راحت اور سکون کا باعث ہو سکتا ہے کہ قبر میں بھی ان کی اولاد کو سکون میسر آئے۔

اولاد' والدین کے اخلاق کی آئینہ دار

اولاد کی تربیت میں حسن اخلاق کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ دین' اخلاق' عمل صالح وغیرہ کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات بھی اگر اچھے انداز سے کی جائے تو وہ بہترین نتیجہ برآمد کرتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اولاد اپنے والدین سے بداخلاقی' بدتمیزی' بدزبانی' گالی گلوچ' غصہ' جھوٹ' غیبت وغیرہ جیسے مہلک اعمال سیکھ کر اسے اپنی شخصیت کا حصہ بنا سکتی ہے جو یقیناً والدین کی بدنامی کا باعث ہے۔ اور یہی اولاد اپنے والدین سے پیار و محبت' اچھا اخلاق' نرم گفتگو' تحمل مزاجی' سچائی' عدل و انصاف کی علمبردار بن کر اپنی شخصیت کو چار چاند لگانے کے ساتھ ساتھ والدین کی نیک نامی کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ ان دو قسم کے کرداروں

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔

میں والدین کا عمل دخل بے انتہا ہے۔ شادی کے بعد ازدواجی زندگی میں ہر دو طرفہ کردار ہیں' یا تو والدین کا نام لے کر تعریف کر دی جاتی ہے یا والدین کو خود بھی برا بھلا کہنے اور آگے اپنی اولاد کی بھی تمام برائیاں ان کے سر تھوپنے میں گزر جاتی ہے' بلکہ مُردوں کو بھی نہیں بخشا جاتا۔ اس ضمن میں ہمیں نبی اکرم ﷺ اور ان کے غلام کے مابین تعلقات کو لازماً راہِ عمل بنانا ہوگا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے والدین جب ان کو نبی مکرم ﷺ سے لینے آئے تو انہوں نے جانے سے انکار کر دیا' حالانکہ نبی پاک ﷺ نے ان کو روکا بھی نہیں تھا' لیکن حضرت زیدؓ نبی اکرم ﷺ کے حسن سلوک' پیار محبت اور رحمت و شفقت کے معتقد اور گرویدہ ہو چکے تھے۔

اولاد کو فرائض سے آگاہ کرنا بھی ضروری ہے

والدین کے لیے اپنے حقوق سے صرفِ نظر کرنا اور اولاد کے حقوق کا خیال رکھنا درحقیقت بہترین رہنمائی ہے۔ البتہ اپنے ان حقوق کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کر دیے ہیں' اولاد کو بتانا' سمجھانا اور شادی سے پہلے ان پر عمل کروانا اس لیے ضروری سمجھنا چاہیے کہ یہ اللہ ربّ العالمین کی طرف سے عائد کردہ ہیں اور ان کی اہمیت کے لیے اتنا کافی ہے کہ ان کو خالق کائنات نے قرآن مجید میں بیان فرما دیا ہے۔ اس لیے والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کو آگاہ کریں کہ اونچی آواز میں والدین کے سامنے بولنا' ڈانٹنا' ان کی نافرمانی کرنا' ان سے بغاوت کرنا' ان کے حکم کو اپنی مرضی اور اپنی شان کے خلاف سمجھنا' یہ سب گناہ کبیرہ کے زمرے میں آتے ہیں اور ان تمام برے اعمال کے نتائج دنیا میں ناکامی اور آخرت میں سزا کی صورت میں سامنے آئیں گے (اعاذنا اللہ منہا)۔ البتہ خود والدین کو اپنی اولاد سے زیادہ سے زیادہ عفو و درگزر' چشم پوشی اور اولاد کو ان کی غلطیوں پر معاف کرتے رہنا جن میں گناہ کا عنصر شامل نہ ہو' بے انتہا ضروری ہے۔ جبکہ اللہ کے احکامات کے حوالے سے ان کو دین کی طرف راغب کرنے میں سختی اور مار بھی دینی پڑے تو دینی چاہیے لیکن کبھی کبھی۔ اس حوالے سے ہمیں نبی اکرم ﷺ کا قول مبارک ملتا ہے کہ اولاد اگر دس سال کی ہونے پر بھی نماز کی طرف مائل نہ ہو تو ان کو مارو۔ بہرحال یہ مار اور سختی اسی وقت کارگر ثابت ہوگی جب والدین ایک عرصہ تک پیار محبت سے اولاد کو نماز یا دوسرے دینی معاملات کی طرف مائل کرتے رہے ہوں گے۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ''منتخب نصاب''

شمیم انصاری

علماء کرام نے ہر دور میں قرآن مجید کے ترجمہ' تشریح اور تفسیر پر بے بہا کام کیا ہے۔ ہر عالم دین نے اپنی استطاعت اور اپنی علمی استعداد کے مطابق مطالعۂ قرآن مجید کے مختلف گوشوں کو اپنی علمی' مشاہداتی اور فکری قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے جلا بخشی' جس سے ہر مؤمن نے اپنے ذہنی معیار' استطاعت اور اپنی فکری سطح پر استفادے کی کوشش کی اور فلاح کی راہ پائی۔ جس طرح علوم ترقی پاتے جا رہے ہیں' سوچ و فکر کے دھارے بدلتے جا رہے ہیں اور ان میں وسعت پذیری ہو رہی ہے' اسی رفتار سے علماء دین اپنی کاوشوں کو تیز تر کرتے جا رہے ہیں تاکہ ثابت کر سکیں کہ قرآن مجید تاقیامت ''الہدیٰ'' ہے اور اس بحرِ زخار سے ابد الآباد تک علوم و معارف کے جواہر نایاب برآمد ہوتے رہیں گے۔

میں ان تمام علماء دین' جو ماضی بعید' ماضی قریب اور حال میں یہ فریضہ تندہی سے سرانجام دے رہے ہیں' کا ذکر کروں اور ان کی کاوشوں پر روشنی ڈال سکوں' یہ کام مجھ جیسے شخص کے لیے ناممکن ہے۔ میں صرف اس شخص کے بارے میں مختصراً عرض کر سکوں گا جس کی تعلیمات سے مجھے قرآن مجید کا کچھ فہم حاصل ہو سکا۔ ایک مختصر عرصہ مجھے تنظیم اسلامی کے رفقاء و احباب کے ساتھ مل بیٹھنے اور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم و مغفور سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ انہی تاثرات کو میں زیر تحریر لانے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارہائے نمایاں کو مکمل طور پر تحریر میں لانا اور ان کی تصنیفات و تالیفات کا مکمل احاطہ کرنا ناممکنات میں سے ہے' البتہ ان پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور ان کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے میں ڈاکٹر صاحب کی تعلیمات کے ان پہلوؤں کو سادہ پیرایہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں جو میری دانست میں آ چکے ہیں — ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے بڑی کاوش جسے میرے ذہن نے بہت حد تک قبول کیا' وہ ان کا

مرتّب کردہ ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' ہے۔ آپ نے اس نصاب کی بنیاد سورۃ العصر پر رکھی جو کہ قرآن مجید کی مختصر ترین سورتوں میں سے ایک ہے۔ یہ سورۃ تین آیات پر مشتمل ہے اور اس کی ہر آیت میں ایک خاص مضمون پنہاں ہے جو فلسفہ حیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس منتخب نصاب کے دروس بارہا دیئے' جو مفصّل بھی تھے اور مختصر بھی۔ ایک موقع پر جناب ڈاکٹر صاحب نے دروس کی جو ریکارڈنگ کروائی اس میں ہر درس کا دورانیہ ایک گھنٹہ تھا۔ جن لوگوں کو ان دروس کے سننے کا موقع ملا انہوں نے قرآنی فکر کو آگے بڑھانے میں اس طریقہ کو بہت پسند کیا۔ ایک ہی نشست میں ایک درس کو سننے کے بعد تشنگی تو باقی رہی ہوگی اور ممکن ہے کہ سننے والوں نے درس کے دوران درس کے نوٹس (notes) لینے کی کوشش بھی کی ہو' لیکن ڈاکٹر صاحب کے انداز بیان میں روانی اور چاشنی یقیناً نوٹس لینے میں آڑے آئی ہوگی' کیونکہ درس کے دوران نوٹس لیتے وقت مضمون پر گرفت قائم رکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے اور اگر مضمون پر توجہ مرکوز کی جائے تو سامع اندازِ بیان کی حلاوت سے محروم رہ جاتا ہے۔ اگر اندازِ بیان توجہ کا محور بن جائے تو روانی تھمنے کو نہیں آتی ہے اور چاشنی اپنی حیثیت کھونے لگتی ہے۔ ان تمام چیزوں کو ہمہ وقت قائم رکھنا خاصا دشوار کام ہے۔

جناب ڈاکٹر صاحب نے سامعین کے اس شوقِ سماعت کو بھانپ لیا اور اس دقت کا بھی اندازہ ہوا۔ یہ بات بہت کم مقررین کے ذہن میں آتی ہے کہ جو کچھ اس نے کہا وہ کس حد تک سننے والے کو ذہن نشین ہوا اور وہ کس حد تک درس سے محظوظ ہوتا رہا۔ ہو سکتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے نکات سامع کے ذہن سے محو ہو گئے ہوں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اور ان کی ٹیم نے اس امر کو فوراً بھانپ لیا اور ان دروس کو چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں ڈھال دیا گیا۔ اس لیے کہ دروس پڑھنا اور دروس سننا دونوں الگ اہمیت کے حامل ہیں — مجھے نہیں معلوم کہ یہ فریضہ کن کن مراحل سے گزرا اور اس میں کن کن لوگوں کی کاوش شامل حال رہی' لیکن میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مراحل کو سرانجام دینے والوں کو اجرِ عظیم عطا فرمائے' آمین! — مجھے جب یہ منتخب نصاب پڑھنے اور سمجھنے کا شوق ہوا تو میں نے منتخب نصاب کے دروس کو ان کتابچوں کی شکل میں پایا۔ یہ کتابچے تعداد میں تقریباً پچیس ہیں اور اب تو ان کتابچوں کو جمع کر کے دو حصوں پر مشتمل کتاب کی صورت دے دی گئی ہے۔

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے دروس مختلف ادوار میں ڈاکٹر صاحب نے خود

دہرائے اور ان میں جو اندازِ بیان‘ جوش و ولولہ‘ الفاظ و بیان کی وارفتگی اور موقع و محل کے مطابق آواز و آہنگ کے مد و جزر جیسی خصوصیات ہیں وہ کتابچوں کی شکل میں کیسے محفوظ کی جا سکتی ہیں؟ لہٰذا اس تشنگی کو دور کرنے کے لیے ان دروس کو آڈیو کیسٹس میں بھی محفوظ کیا گیا۔ ان دروس کو جناب ڈاکٹر صاحب نے بار بار بیان کیا۔ شروع میں ایک ایک گھنٹے کے ۴۴ آڈیو کیسٹس پر یہ دروس محفوظ کیے گئے‘ لیکن یہ سلسلہ یہاں پر رک نہیں گیا بلکہ اس میں وسعت آنا شروع ہوئی۔ ۱۹۹۳ء میں محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے منتخب نصاب کے تفصیلی دروس ریکارڈ کروائے جو ۱۴۷ گھنٹے دورانیہ پر محیط تھے۔ مضامین وہی تھے لیکن ان میں وسعت آتی چلی گئی اور ان دروس کے فہم میں اضافہ ہوا۔ یہ سلسلہ یہاں بھی نہ رکا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو ایسی بصیرت دی کہ یہ طوفان تھمنے کو نہ آتا تھا۔ ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۴ء کے دوران محترم ڈاکٹر صاحب نے ایک بار پھر منتخب نصاب کے دروس کی ریکارڈنگ کروائی۔ یہ دروس ۶۰ اور ۹۰ منٹ کے ۸۰ آڈیو کیسٹس میں محفوظ کیے گئے۔ اس حوالے سے لوگوں کا اشتیاق بھی بڑھتا چلا گیا۔ آڈیو کیسٹس کے علاوہ ان دروس کی ویڈیو کیسٹس بھی تیار ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چہار دانگ عالم میں پھیل گئیں۔ ان دروس کو سننے کے لیے ایک خاصا وقت درکار ہے لیکن پھر بھی بہت سے لوگوں نے ان دروس کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس خریدے اور انہیں اپنی لائبریریوں کا لازمی جزو بنا دیا اور جیسے ہی فرصت کے لمحات میسّر آتے‘ انہیں سنتے رہتے۔

کیسٹس کے بعد جب سی ڈی کا دور آیا تو منتخب نصاب کے دروس کو وی سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز میں ڈھال دیا گیا اور انہیں کمپیوٹر میں save کرنے کی سہولت بھی میسّر آ گئی۔ اِس وقت ۴۴ کیسٹس والے دروس ایک MP3 سی ڈی میں‘ جبکہ ۱۹۹۳ء کے مفصّل دروس تین MP3 سی ڈیز میں دستیاب ہیں۔ سب سے آخر میں ریکارڈ ہونے والے دروس دو MP3 سی ڈیز کے علاوہ بارہ DVDs میں محفوظ کیے گئے ہیں اور یہ سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں اشاعت پذیر ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی زندگی کے دوران اور اس کے بعد اب تک ڈاکٹر صاحب کے شاگردانِ رشید دروس کا یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری رکھے ہوئے ہیں اور اب تو ملٹی میڈیا نے اس مسئلہ کو مزید آسان تر کر دیا ہے۔ درس کا متن پردہ سکرین پر آتا ہے اور سامعین و ناظرین

کی نگاہیں اس متن پر مرکوز ہوتی ہے اور پھر چیدہ چیدہ نکات کی تشریح ہوتی چلی جاتی ہے اور اس طرح سے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہم میں موجود ہیں اور ان نکات کی طرف ہماری توجہ دلا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عظیم صدقہ جاریہ ہے‘ جو اس جہانِ فانی سے کوچ کر جانے کے باوجود جناب ڈاکٹر صاحب کے نامۂ اعمال میں مسلسل کریڈٹ ہو رہا ہے۔ ان کے شاگردانِ رشید میں ایک نمایاں نام جناب ڈاکٹر طاہر خاکوانی صاحب کا ہے‘ جنہوں نے ہفتہ میں ایک روز جمعرات کے دن مغرب تا عشاء قرآن اکیڈمی ملتان میں نہایت باقاعدگی سے منتخب نصاب کے دروس کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اور بہت سے لوگ آپ کی اس کاوش سے مستفید ہو رہے ہیں۔

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ
کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ
توبہ کی عظمت اور تاثیر
اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام
اشاعتِ خاص: 60 روپے   اشاعتِ عام: 30 روپے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کئی مثالیں موجود ہیں کہ سولہ افراد کے گھرانے میں سے صرف دو زندہ بچے۔ یہ زندہ رہ جانے والے افراد یا خودکش حملہ آور بنے یا انہوں نے پاکستانی فوج کے خلاف گوریلا کارروائیاں کیں۔ ان کے پاس دلیل ہے کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرے تو تم بھی بدلہ لے سکتے ہو۔ اس انتقامی کارروائی میں کنٹرول رکھنا اکثر کے بس کی بات نہیں۔ قلم کی حرمت کا تقاضا ہے کہ بات سچی اور کھری کہی جائے چاہے وہ کسی کے خلاف جائے۔ کچھ ناپسندیدہ لوگ جو لوٹ مار اور قتل و غارت میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ بھی طالبان کا روپ دھار چکے ہیں۔ کچھ باقاعدہ ’’را‘‘ اور ’’سی آئی اے‘‘ سے اپنا تعلق استوار کر چکے ہیں اور ڈالروں کی لالچ میں شہری علاقوں میں دھماکے کر رہے ہیں اور غیر ملکی ایجنسیوں کی سرپرستی میں پاکستان میں عدم استحکام پیدا کر رہے ہیں۔

اگر حکومت مذاکرات میں سنجیدہ ہے تو سب سے پہلے اسے چاہیے کہ امریکہ کی جنگ سے الگ ہو اور ایسا علی الاعلان کیا جائے۔ پھر طالبان کے مختلف گروپس سے الگ الگ بات چیت کر کے اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ کون سے گروپس ایسے ہیں جو ایک نظریہ کی وجہ سے یا فوجی آپریشن میں زیادتی کی وجہ سے یا کسی غلط فہمی کی وجہ سے ریاست پاکستان کے خلاف اصولی جنگ کر رہے ہیں۔ ان طالبان کے نقصانات کی تلافی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے‘ ان کے تحفظات کو دُور کرنے کی کوشش کی جائے اور صحیح تر الفاظ میں ان کے دل جیتنے کی کوشش کی جائے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جب باقی ماندہ اور ناپسندیدہ عناصر یا غیر ملکیوں کے ایجنٹ بے نقاب ہو جائیں گے تو نظریاتی طالبان ان کے خلاف افواجِ پاکستان کی مدد کریں گے۔ اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اس معاملے میں نہ صرف امریکہ کا کوئی دباؤ قبول نہ کیا جائے بلکہ اس سارے عمل سے اسے بالکل الگ تھلگ رکھا جائے‘ وگرنہ کسی صورت میں مذاکرات کامیاب نہ ہوں گے۔ جانبین خلوص اور نیک نیتی سے مذاکرات کریں‘ چالاکی یا عیاری سے کام نہ لیا جائے اور نہ فریق ثانی کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے۔ کچھ لوگوں کی رائے میں حکومت پاکستان نے جو مذاکرات کی یکدم رٹ لگانی شروع کی ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکومت صرف یہ چاہتی ہے کہ انتخابات خیر و عافیت سے ہو جائیں‘ بعد میں دیکھا جائے گا۔ اگر اس قول میں رتی بھر بھی حقیقت ہے تو اس بدنیتی کے نتائج نہ صرف ایسی سوچ رکھنے والوں کو بھگتنے پڑیں

گے‘ بلکہ پاکستان کے لیے بحیثیت ریاست تباہ کن ثابت ہوں گے۔ مذاکرات کے حوالہ سے فوج نے اعلان کیا ہے کہ یہ حکومت کا کام ہے اور فوج حکومتی فیصلے کی پابندی کرے گی۔ اصولی طور پر یہ بات درست ہے‘ لیکن اتنا زیادہ بھولا پن بھی مفید نہیں رہے گا۔ کون نہیں جانتا کہ دہشت گردی کے حوالہ سے جنگ میں اصل فیصلہ کن قوت عسکری قیادت ہے اور افواجِ پاکستان کی رضامندی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم سمجھتے ہیں فوج کو حکومت کی رہنمائی کرنی چاہیے کہ کس طرح مذاکرات کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔

آخر میں ہم اے این پی کی اس آل پارٹیز کانفرنس کا ذکر کرنا ضروری سمجھیں گے جس میں ۲۴ جماعتوں نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی ہے جس کے مطابق طالبان سے مذاکرات کو ضروری اور ناگزیر قرار دیا گیا ہے۔ قرارداد کے مطالعہ کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ انتخابات قریب ہیں‘ اب اے این پی کے ذمہ داران کو حکومتی حصار سے باہر آنا ہوگا‘ لہٰذا حفاظتی اقدام کا پہلے کی طرح اہتمام نہیں کیا جا سکے گا‘ تو اے این پی پر خوف طاری ہے۔ انہیں اپنی وہ کارروائیاں یاد آ رہی ہیں جو انہوں نے امریکہ سے مل کر طالبان کے خلاف کی ہیں‘ لہٰذا یہ کل جماعتی کانفرنس اپنی skin save کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اے این پی نے اس کانفرنس کے لیے کوئی ہوم ورک نہیں کیا ہوا تھا۔ مشترکہ اعلامیہ میں امریکی ڈرون حملوں کی مذمت بھی نہ کی گئی تھی۔ امریکہ کی اس جنگ سے فوج کے الگ ہونے کا بھی کوئی مطالبہ بلکہ ذکر تک نہ تھا۔ جماعت اسلامی اور تحریک انصاف جو صوبہ میں اس وقت خاصی مقبول جماعتیں ہیں انہوں نے اس کانفرنس میں شرکت نہیں کی اور نہ ہی انہیں شریک کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سنجیدہ معاملات کو سلجھانے کے لیے لیپا پوتی سے کام نہیں چلتا۔ نیک نیتی‘ خلوص اور کر گزرنے کا عزم ہونا چاہیے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ نادان بھی بالآخر وہی کرتا ہے جو کچھ دانا کرتا ہے...... لیکن بڑی خرابی کے بعد!

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا

Mar. 2013
Regd. CPL No. 115
vol. 62
No. 3

Monthly Meesaq Lahore

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیے ۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 400 روپے
اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 250 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: 042-35869501-3
maktaba@tanzeem.org

زندگی کے سارے سُکھ، صحت اور تن دُرستی سے ہیں

تن سُکھ سے تن دُرست

تن سُکھ جسم و جاں کو تقویت پہنچاتا ہے، نظامِ ہضم اور افعالِ جگر کی اصلاح کرتا ہے۔

ہمدرد کے متعلق مزید معلومات کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے:
www.hamdard.com.pk

Adarts HTS-12/07(R)